Regd. L. No 7243

Phone. [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1973

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان

اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی

قیمت کب ادا کرتے ہیں

[illegible]

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ــــــ دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ــــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ

☆

ایک روپیہ

جلد (۲۶) — ستمبر ۱۹۷۳ء — نمبر (۹)

فہرست

(۱) لمعات ــــــ ۲

(۲) مدیر ہفت روزہ نظریہ پاکستان (لائلپور) کے سوالات کے جواب ــــــ ۷
(محترم پرویز صاحب)

(۳) باب المراسلات ــــــ (اغلاط سے پاک قرآن مجید) ــــــ ۱۸

(۴) کیا ہم آزاد ہیں؟ ــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ ۲۵

(۵) حقائق و عبر ــــــ بے غیرتی کی انتہا، (آزادی حاصل ہو گئی) (محترم ہم کو گئی نہیں آتی) ۵۳
(سید جمال الدین افغانی کا پیغام)

(۶) علامہ مشرقی (مرحوم) کی یادیں ــــــ ۵۷

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقام اشاعت: ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اختر۔ مطبوعہ: اشرف پریس ایجرٹن روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اب کے اگست کا مہینہ اپنے ساتھ جو تباہیاں لایا ہے، ان کے اثمات برسوں تک مٹ نہیں سکیں گے اور ان کی یاد (شاید) صدیوں تک بھی محو نہ ہو سکے گی۔ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ اس قسم کا سیلاب انہوں نے اپنی مدت العمر میں نہیں دیکھا۔ یہاں سیلاب ۱۹۵۶ء میں بھی آئے تھے لیکن نہ ان کی آوردہ تباہیاں ایسی شدید تھیں، نہ وسعت ایسی عالمگیر۔ اسوقت (یعنی وسط اگست تک جب یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں) کیفیت یہ ہے کہ پنجاب میں شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو جو ان کی زد سے محفوظ رہ گیا ہو۔ بستیاں اجڑ چکی ہیں۔ آبادیاں تباہ ہو گئی ہیں۔ انسانی جانیں اور مال مویشی کس حد تک تلف ہو چکے ہیں، اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ فصلوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ مواصلات کے تمام سلسلے منقطع ہو چکے ہیں۔ نہ کوئی سڑک محفوظ رہ گئی ہے، نہ ریل کی پٹڑی۔ سیلاب زدہ علاقوں کے جو انسان ابھی تک زندہ ہیں وہ نسبتاً کسی اونچی جگہ پر، کھلے آسمان کے نیچے، بے ساز و سامان پڑے ہیں۔ نیچے سیلاب کی تلاطم خیزیاں ہیں، اوپر سے یا مینہ برس رہا ہے، یا جھلس دینے والی دھوپ پڑ رہی ہے۔ جو ابھی تک محفوظ ہیں، وہ بھی اپنی اپنی جگہ متوحش بیٹھے ہیں کہ معلوم نہ کس وقت اس آفت کا شکار ہو جائیں۔ یہ ہے وہ تباہی جس نے اسوقت ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ کل کو کیا ہونے والا ہے، اس کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس تباہی میں چاروں طرف سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں کہ یہ خدا کا عذاب ہے۔ اس کا غضب ہے جسے وہ بندوں پر نازل کرتا ہے۔ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔ یہ ہماری شامت اعمال ہے۔ اس کے لئے ہمیں خدا کیطرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیئے۔ توبہ کرنی چاہیئے۔ اس کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کرنی چاہئیں کہ وہ ہمارے حال پر رحم کرے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ان الفاظ کا تعلق ہے، یہ سب صحیح ہیں، لیکن جو مفہوم عام طور پر ان سے لیا جاتا ہے، وہ نہ صرف غلط ہوتا ہے، مگر گمراہ کن بھی۔ یہ سطور اسی غلط فہمی اور مغالطہ آفرینی کو دور کرنے کے لئے لکھی جا رہی ہیں۔

ہمارے ہاں خدا کا تصور ہمارے دورِ ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ اس تصور کی رو سے خدا ایک مطلق العنان آمر (بادشاہ) کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نہ ضابطہ ہے نہ آئین۔ سب کچھ اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔ وہ خوش ہو جاتا ہے تو انعام و اکرام کی بارشیں کر دیتا ہے۔ ناراض ہوتا ہے تو اپنا غضب اور عذاب نازل کر دیتا ہے۔ سیلاب، قحط (خشک سالی)، زلزلے، وبائی امراض مثل ہیضہ، طاعون، سب اس کے غضب (ناراضگی) کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں خدا کو خوش کرنا چاہیئے تاکہ وہ ہمیں اپنے عذاب سے محفوظ رکھے۔ خدا کا اس قسم کا تصور (جو

اپنی اصل کے اعتبار سے یہودیت کا پیدا کردہ تھا) ہمارے ہاں مروّج تھا کہ اس میں، ہمارے زمانے کے "مامور من اللہ" (مرزا غلام احمد قادیانی) نے کچھ اور رنگ آمیزی کی۔ ان کے زمانے میں پنجاب میں طاعون پھوٹا تھا اور اس نے وبائی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:

> حمامۃ البشریٰ میں جو کئی سال طاعون پیدا ہونے سے پہلے شائع کی تھی میں نے یہ لکھا تھا کہ میں نے طاعون پھیلنے کے لئے دعا کی ہے۔ سو وہ دعا قبول ہو کر ملک میں طاعون پھیل گئی۔ (حقیقۃ الوحی ص)

دوسری جگہ ہے۔

> براہین احمدیہ کے آخری اوراق کو دیکھا تو ان میں یہ الہام درج تھا۔ "دنیا میں ایک نذیر آیا اور دنیا نے اس کو قبول نہ کیا۔ پر خدا اسکو قبول کرے گا اور بڑے زور آور حملوں سے اسکی سچائی ظاہر کر دیگا" اس پر مجھے خیال آیا کہ اسوقت دنیا کہاں تھی اور ہمارا دعوے بھی نہ تھا لیکن اس الہام میں ایک پیشگوئی تھی جو اسوقت طاعون پر صادق آرہی ہے۔ اور زور آور حملوں سے طاعون مراد ہے۔
>
> (ملفوظات احمدیہ، حصہ ہفتم۔ مرتبہ منظور الٰہی صاحب)

اس "زور آور حملہ" کی حکمت یہ بیان فرمائی:

> یہ طاعون ہماری جماعت کو بڑھاتی جاتی ہے اور ہمارے مخالفوں کو نابود کرتی جاتی ہے اور ہر ایک مہینے میں کم از کم پانسو آدمی اور کبھی ہزار دو ہزار آدمی بذریعہ طاعون ہماری جماعت میں داخل ہوتا ہے۔ پس ہمارے لئے طاعون رحمت ہے اور مخالفوں کے لئے زحمت اور عذاب ہے۔ اور اگر دس پندرہ سال تک ملک میں ایسی ہی طاعون رہی تو میں یقین رکھتا ہوں کہ تمام ملک احمدی جماعت سے بھر جائیگا ...... پس مبارک وہ خدا ہے جس نے دنیا میں طاعون کو بھیجا تاکہ اس کے ذریعے سے ہم بڑھیں اور ہمارے دشمن نیست و نابود ہوں۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی حاشیہ ص ۱۳۳-۱۳۱)[1]

یہ ہے خدا کا وہ تصور جو انہوں نے پیش کیا اور اس قسم کی عالمگیر تباہیوں کی "حکمت بالغہ" جو انہوں نے بتائی!

آپ آیئے دوسری طرف توجیہہ کی طرف — کہ یہ سب ہماری شامتِ اعمال اور ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ہاں "گناہوں" سے مراد لی جاتی ہے۔ احکام شریعت کی خلاف ورزی اور بدعملی سے مفہوم ہوتا ہے۔ فسق و فجور، شراب خواری، قماربازی، فحش کاری، رقص و سرود وغیرہ۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کا خدا کا عذاب اس لئے آتا ہے کہ قوم نماز، روزہ، وغیرہ کی پابند نہیں رہتی اور فسق و فجور کی زندگی بسر کرتی ہے۔ رجوع الی اللہ (توبہ وغیرہ) سے مقصود ہوتا ہے اس قسم کی معصیت کی زندگی کو ترک کر کے، نیک زندگی اختیار کر لینا۔

آیئے ہم دیکھیں قرآن کی رو سے حقیقت کیا ہے اور اس قسم کے الفاظ کا صحیح مفہوم کیا۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ خدا وہ ہے جو اپنی قدرت کاملہ سے اس کائنات کو عدم سے وجود میں لایا۔ اور اس کے بعد اس نے اپنے اختیارِ مطلق کی رو سے ایسے قوانین نافذ کئے جن کے مطابق یہ کارگہ کائنات رواں دواں ہے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں اور اسی وجہ سے نظم

---

[1] ان حوالوں کیلئے ہم "قادیانی مذہب" مؤلفہ محترم الیاس برنی (مرحوم) کے شکرگزار ہیں۔

نستی کا ئنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے۔ اس لئے انسان کو اس امر کی صلاحیت عطا کر دی ہے کہ وہ ان قوانین کو سمجھ سکے۔ جوں جوں یہ ان قوانین کو سمجھتا جائیگا، فطرت کی قوتیں اس کے تابع فرمان ہوتی جائینگی۔ قرآن کریم میں تسخیرِ کائنات کے سلسلہ میں جو آیات آئی ہیں (اور ان کی تعداد کثیر ہے) ان سے یہی مراد ہے۔ شمس و قمر کی تسخیر (۱۳:۲)۔ لیل و نہار کی تسخیر (۱۳:۱۴)۔ سمندروں کی تسخیر (۱۴:۱۶)۔ دریاؤں کی تسخیر (۳۲:۱۴)۔ جو کچھ زمین پہ ہے اس سب کی تسخیر (۶۵:۲۲) حتیٰ کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ (۲۰:۳۱) ارض و سما کی تسخیر۔ زمین کی بھی اور اجرامِ فلکی کی بھی۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ تسخیر، قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرنے سے ہوتی ہے۔ یاد رکھئے! قوانینِ فطرت بھی خدا ہی کے قوانین ہیں۔ ان کی اطاعت، قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے اور ان کی خلاف ورزی، قوانینِ خداوندی کی معصیت۔ جو قوم ان قوانین کی اطاعت کرے گی، وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اپنے کام میں لائے گی اور اسطرح اس کی دنیاوی (طبیعی) زندگی فطرت کی عطا کردہ نعمتوں سے مالا مال ہو جائے گی۔ جو ان قوانین کا علم حاصل نہیں کرے گی یا ان سے اعراض برتے گی، وہ نہ صرف یہ کہ ان نعمتوں سے محروم رہ جائے گی بلکہ فطرت کی قوتیں بیباک ہو کر ان کے ہاں تباہیاں مچا دیں گی۔ اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب فطرت کی قوتیں بیباک ہوتی ہیں تو اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ جب وہ قوتیں، انسان کے تابع فرمان ہوتی ہیں، تو وہ اس کی مرضی کے مطابق نتائج پیدا کرتی ہیں۔ اس میں (ہمارے اصطلاحی معنوں میں) "مومن" اور "کافر" کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ جو انسان یا جو قوم بھی چاہے ان قوتوں کو مسخر کر کے ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتی ہے۔ اس مقام پہ البتہ ایک فرق ضرور ہوتا ہے۔ جو قوم ان قوتوں کو مسخر نہیں کرتی، اسے مقامِ آدمیت نصیب نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان قوتوں کی تسخیر انسانی علم کی ترقی اور وسعت کے ساتھ بڑھے گی۔ لیکن جو قوم دنیا کو قابلِ نفرت قرار دیکر ان قوتوں سے اجتناب اور اعراض برتے گی، وہ اس میدان میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھا سکیگی۔ اس کا شمار "صفِ آدمی" میں کیسے ہو سکے گا؟

اس سے واضح ہے کہ سیلاب، خشک سالی، زلزلے، وبائی امراض وغیرہ کا تعلق نظامِ فطرت سے ہے اور یہ حوادث، قوانینِ فطرت کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ جو قومیں ان قوانین کا علم حاصل کر کے، حفاظتی تدابیر اختیار کر لیتی ہیں، ان کے ہاں یہ حوادث تباہی نہیں مچاتے۔ یہ قومیں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتی ہیں اور اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا نتیجہ امن و سلامتی ہوتا ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئیے۔ اگر بارش کا بے پناہ پانی، سیلاب کی شکل کر کے ایسے پہاڑوں، جنگلوں، میدانوں، صحراؤں سے گزر کر سمندر میں جا گرے، جن میں کوئی انسانی آبادی نہ ہو، تو یہ سیلاب کسی تباہی کا موجب نہیں ہو سکتا۔ یہ حوادث تباہی اسوقت بنتے ہیں جب انسان ان سے متاثر ہوں۔ ان قوتوں سے انسانوں کے متاثر ہونے کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو وہ شکل جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں ــــ یعنی وہ قوم جو سیلاب کی گذرگاہوں میں اپنی بستیاں بسالے لیکن اس سے حفاظت کی کوئی تدبیر اختیار نہ کرے۔ وہ تباہ ہو جائے گی۔ اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ ایک قوم ان قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں اپنے مفاد حاصل کرنے کے لئے دوسرے انسانوں کے خلاف استعمال کرے۔ اب ظاہر ہے کہ اس دوسری شکل میں، فطرت کی قوتیں از خود کوئی تباہی نہیں مچاتیں۔ انسانی اختیار ان سے تباہی پیدا کرتا ہے یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے اس اختیار کو کسطرح کنٹرول میں رکھا جائے کہ یہ فطرت کی قوتوں کو دوسرے

انسانوں کی تباہی کے لئے استعمال نہ کرے۔ چونکہ کنٹرول، قانون کی رُو ہی سے ممکن ہوتا ہے، اس لئے اس کنٹرول کے لئے بھی قوانین کی ضرورت ہو گی۔ یہ قوانین بھی خدا کی طرف سے ملتے ہیں۔ انہیں وحی کا عطا کردہ ضابطہ کہا جاتا ہے۔ یہ ضابطہ، قوانین بتاتا ہے۔ کہ فطرت کی قوتوں کو انسانوں کی تباہی کے لئے نہیں بلکہ ان کی منفعت کے لئے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جو لوگ ان قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، ایسا نظام قائم کر لیتے ہیں جس میں فطرت کی قوتیں، انسانی تباہی کے لئے نہیں بلکہ منفعتِ عامہ کے لئے صَرف کی جاتی ہیں، انہیں، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں، جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ، قوانینِ خداوندی کے دونوں ضابطوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس ضابطہ کی بھی جسے قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے، اور اس کی بھی جسے وحی کہا جاتا ہے (اور جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے) اس اطاعتِ خداوندی سے ان کی اپنی قوم بھی حوادثِ فطرت کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہتی ہے اور دیگر اقوامِ عالم بھی ان سے مصئون۔ قرآن مجید کے الفاظ میں، یہ قوم اُس خدا کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے جو اِلٰہٌ فِی السَّمَآءِ بھی ہے اور اِلٰہٌ فِی الْاَرْضِ بھی (۴۳ : ۸۴)۔ یعنی سماوی قوانینِ خداوندی کی بھی مطیع اور ارضی قوانین کی بھی۔

اس سے ہمارے سامنے تین قسم کی قومیں آجاتی ہیں:

(۱) وہ قوم جو اِلٰہ الارض پر بھی ایمان رکھتی ہے اور اِلٰہ السماء پر بھی یعنی وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرتی ہے اس سے وہ خود بھی امن و سلامتی میں رہتی ہے اور عام انسانیت بھی۔ اگر کبھی کوئی ایسا حادثہ رُونما ہو جاتا ہے کہ سلم انسانی کی کمی کی وجہ سے اس کی روک تھام نہیں ہو سکتی تو یہ لوگ (مومنین) باہمی ہمدردی، ایثار، قربانی اور تعاون سے اسکا اس طرح مقابلہ کرتے ہیں کہ اس کے پیدا کردہ نقصان کا ازالہ ساتھ کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو ہولناک قحط پڑا اور جو تباہ کن طاعون پھوٹا تھا جماعتِ مومنین اور ان کے سربراہ نے ان کا مقابلہ اسی طرح کیا تھا۔ یہی وہ قوم ہوتی ہے جس کا ایمان، صحیح معنوں میں ایمان کہلانے کا مستحق اور جن کے اعمال، اعمالِ صالح بننے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان کی یہ زندگی بھی کامیابیوں اور خوشگواریوں کا پیکر ہوتی ہے اور اُخروی زندگی بھی سرفرازیوں اور شادابیوں کی حامل۔

(۲) دوسری قسم کی قوم وہ ہوتی ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیتی ہے لیکن انہیں صرف کرتی ہے اپنے مفاد کے تحفظ اور دوسری قوموں کے استحصال کی خاطر۔ انہیں ہنگامی طور پر کامیابیاں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن عام انسانیت ان کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہوتی؛ اس لئے ان کا نظام آخر الامر عالمگیر تباہیاں لاتا ہے یعنی یہ وہ قومیں ہیں جو (خدا کے) قوانینِ فطرت کی تو اطاعت کرتی ہیں لیکن اس کے ان قوانین سے سرکشی برتتی ہیں جن کا تعلق عالم انسانیت سے ہے۔ یہ ہیں یورپ کی مادہ پرست قومیں۔

(۳) اور تیسری شق ان اقوام پر مشتمل ہوتی ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتیں اور جب وہ ان قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتیں تو انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ "مذہب پرست" کہلاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ اس دنیا کی ذلت و خواری اور آخرت کی روسیاہی ہوتا ہے۔ ہمارا شمار انہی اقوام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ۱۹۵۸ء میں عالمگیر سیلاب آئے تھے۔ خدا کے قوانینِ فطرت

پھر اگر ہمارا ایمان ہوتا تو ہم اس زمانے میں ایک شعبہ ریسرچ کے لئے قائم کر دیتے کہ ہمارے ہاں سیلاب کی وجوہات کیا ہیں۔ اور ان کی روک تھام کس طرح ہو سکتی ہے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ ہماری تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود ان کی طغیانیاں رُک نہ سکیں تو ان کی تباہیوں سے بچنے کے لئے کیا کیا جائے۔ یہ ریسرچ بھی مسلسل جاری رہنی چاہیئے تھی اور یہاں ان کے لئے عملی تدابیر بھی ساتھ کے ساتھ اختیار کئے جاتی رہتیں۔ سولہ سترہ برس کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اگر ہم ایسا کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سیلاب رُک نہ جاتے، اور اگر ایسا نہ بھی ہو سکتا تو ہم ان کی تباہیوں سے محفوظ رہ سکتے۔ لیکن ہم نے یہ کیا نہ وہ۔ ارباب اقتدار (بالعموم) اپنی کرسیوں کی حفاظت کے لئے سرگرداں اور اپنی عیش سامانیوں کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ ماتحت عملہ کی ساری توجہ دولت سمیٹنے کی طرف مرکوز رہی۔ انہوں نے بند بنائے تو ان میں سیمنٹ کی جگہ ریت بھر دی۔ پُل تعمیر کئے تو ان میں لوہے کی جگہ بجری ڈال دی۔ سڑکیں بنائیں تو ان کے تلے میں پتھر کی بجائے مٹی بچھا دی۔ کچھ خود کھایا، کچھ اوپر پہنچایا۔ یہ تھے ہمارے وہ گناہ "جن" کی پاداش میں سیلاب آئے اور انہوں نے عالمگیر تباہی مچادی۔ جب اوپر کے طبقہ کی یہ حالت ہو جائے تو قوم کا کیریکٹر خود بخود گر جاتا ہے۔ وہ اس حد تک گرا کہ لوگ سیلاب سے جان بچا کر بھاگے تو پیچھے سے ان کے گھر لٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان بیکسوں اور ناداروں کے ہاتھ ایک ایک روٹی دو دو روپے میں بیچی گئی۔ چائے کا ایک ایک پیالہ ایک ایک روپے میں بکا۔ انہیں ایک ایک میل کا کرایہ بیس بیس روپے ادا کرنا پڑا اور یہ کچھ ان مصیبت کے ماروں کے ساتھ اسوقت ہو رہا ہے۔ اس کے بعد، قوم کے رہزنوں، قزاقوں، کفن چوروں کے ہاتھوں ان کے ساتھ کیا بیتیگی۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں ہمارے وہ "اعمال" جن کی پاداش میں ہم پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے۔ باہر سے نہیں ہو رہا۔ یہ ہمارے اپنے ہاتھوں کا لایا ہوا ہے۔ وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ۔ (۴۲/۳۰) جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ ارباب نظم و نسق کی عیاری و پرکاری ہوتی ہے (جو مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے پروان چڑھتی ہے) کہ وہ ان تباہیوں کو "خدا کا عذاب اور قوم کے گناہوں کی پاداش" قرار دیکر عوام کی توجہ اُن کے مجرمانہ تغافل کیطرف منتقل نہیں ہونے دیتی، اور انہیں اِن کا محاسبہ اور مؤاخذہ کرنے کے بجائے "توبہ و استغفار" میں اُلجھا دیتی ہے اور اس توبہ و استغفار سے بھی تو اپنی سیرت و کردار کی اصلاح نہیں ہوتی۔ محض ایک میکانکی عمل ہوتا ہے۔ یہی تھی ابلیسِ ملوکیت کی وہ سازش جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ؛

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

سیلاب سے متاثرہ علاقوں کے قارئینِ طلوعِ اسلام، اور بزموں سے متعلق احباب اپنی خیریت سے مطلع فرمائیں۔ اگر کسی کے پتہ میں تبدیلی ہو گئی ہو تو اس سے بھی اطلاع دیں۔

(ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام)

مدیر ہفت روزہ نظریۂ پاکستان (لائل پور) کے سوالات کے جواب

(پرویز)

سوال ۱۔ باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

کیا آئینہ ضمیری سے حضرت علامہؒ کی مراد قرآن کے آئینہ میں صورت نگری سے ہے اور کیا آج کے "کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" سلمان نے اپنے ذہن میں خدا کا تصور وہی نہیں جمالیا ہوا اور اللہ کو "خوش" کرنے کے وہی طور و طریقے نہیں اپنا رکھے جو شاہوں کے درباروں کے لئے مختص تھے۔ اور کیا "سلطانی و ملائی و پیری" ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو نہیں ہیں؟

جواب۔ ایک مغربی مفکر (غالباً لاک) نے کہا ہے کہ تم مجھے کسی قوم کے متعلق اتنا بتا دو کہ اس نے پرستش کیلئے کس قسم کا معبود اختیار کر رکھا ہے تو میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن، معاشرت، سیاست وغیرہ کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ ہے معبود کے تصور کا قوموں کی زندگی سے تعلق۔ قرآن کریم نے اللہ تعالےٰ کی جو صفات حسنہ بیان فرمائی ہیں ان کی رُو سے خدا کا جو بلند و بالا تصور سامنے آتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ آپ کے سوال کی نسبت سے میں اس کی صرف ایک صفت "الحکیم" کا سامنے لانا کافی سمجھتا ہوں۔ "الحکیم" سے مراد ہے ایسا خدا جس کا ہر حکم ایک قانون ہے جو علم و حکمت پر مبنی ہے اور جسے عقل و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اُس نے اپنے ہر قانون کی غرض و غایت (حکمت) بتا دی ہے۔

اور اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ وہ حکم (قانون) کیوں دیا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا اور اس کی خلاف ورزی کا انجام کیا۔ ان قوانین میں نہ کوئی دھاندلی ہے نہ آمریت۔ نہ کسی کے خلاف انتقامی کارروائی، نہ کسی کی رو رعایت۔ یہ قوانین غیر متبدل بھی ہیں اور عالمگیر بھی۔ اس لئے اسی جہت سے ان قوانین پر مشتمل اپنی کتاب (قرآن مجید) کو بھی "الحکیم" کہا ہے اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا کی حکمرانی سے مراد اس کی کتاب کی حکمرانی ہے۔ یعنی قانون کی حکمرانی۔ یہ تھا خدا کا وہ تصور جسے قرآن کریم نے پیش کیا لیکن اس کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں ایک "نئے خدا" کا تصور وضع کیا گیا جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون۔ نہ ضابطہ تھا نہ دستور۔ وہ خالصتہً "شخصی حکمران" یا آمرِ مطلق تھا۔ جو جی میں آئے کرتا اور جس قسم کا چاہے حکم دے دیتا تھا۔ اس کی کیفیت (سعدی کے الفاظ میں) یہ تھی کہ گاہے

بہ سلامے برنجند دگاہے بہ دشنامے خلعت بہ بخشند" ۔۔۔ کبھی سلام کرنے سے ناراض ہو گئے تو گاؤں کے گاؤں پر گدھوں کے ہل چلوا دیئے اور کبھی گالی دینے پر خوش ہو گئے تو جاگیر بخش دی ۔۔۔ اور یا (پنجابی شاعر) راقب کے الفاظ میں ایسا کر:

او تھے کیہہ پرواہ ہے راقب، او تھے بے پرواہیاں
پھڑ لیئے عملاں والیاں نوں، چھڈ دے او گنہاراں نوں

"اے راقب، خدا بڑا بے پرواہ ہے۔ وہ چاہے تو نیک اعمال والوں کو پکڑ لے اور چاہے گنہگار کو چھوڑ دے"

ہمارے دورِ ملوکیت میں اس قسم کا خدا کا تصور وضع کیا گیا اور اس کے بعد کہا کہ "السلطان ظل اللہ علی الارض"۔ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ خدا کا اس قسم کا تصور ہمارے ہاں آج تک چلا آ رہا ہے۔ یہ ہے وہ "سلطانی" جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے۔ استبداد ملوکیت کا اندازہ قرآن کریم میں بیان کردہ اس واقعہ سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ جب ساحرینِ دربار فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی پیش فرمودہ صداقت کو اپنے سامنے دیکھ لیا اور اس طرح اس پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان لے آئے، تو فرعون گرج کر بولا۔ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (۷/۱۲۳)۔ تم میرے حکم اور اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو؟ اب دیکھو میں اس کی تمہیں کیا سزا دیتا ہوں۔ یعنی، اس نے یہ نہیں کہا کہ تم جس بات پر ایمان لے آئے ہو، وہ یوں غلط ہے۔ اس نے کہا یہ کہ تم نے میری اجازت کے بغیر ایسا کیوں کیا ہے؟ یہ ہے استبدادِ سلطانی جس کی رو سے کوئی شخص اپنی سوچ، فکر، بصیرت کی رو سے خود اپنے متعلق بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ ہر فیصلہ کے لئے بارگاہِ سلطانی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

۲۔ لیکن اس قسم کی مستبد آمریت، مذہبی پیشواؤں کی تائید کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس مقصد کے لیے تخت و تاج اور محراب و منبر میں ایک سمجھوتا ہوا جس کی رو سے امورِ مملکت، سلطان کی تحویل میں دے دیئے گئے اور معاملاتِ شریعت، اربابِ مذہب کے قبضے میں۔ اس طرح انسانی زندگی کے ہر دو دائرہ میں استبداد کی حکمرانی قائم ہو گئی۔ سلطان نے اربابِ مذہب کی حکمرانی کا تحفظ کیا اور اربابِ مذہب نے بادشاہوں کی تائید و نصرت کے لئے اپنے خطبوں میں دعائیں مانگیں۔ امت ان کے استبداد کے نیچے پستی رہی۔

ان کے استبداد کی صورت یہ ہے کہ۔ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (۲/۷۹)۔ یہ اپنے فیصلوں کو احکامِ خداوندی کہہ کر لوگوں سے منواتے ہیں۔

۳۔ اس کے بعد ایک تیسرا گروہ آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ سلطان کا تعلق امورِ مملکت سے ہے اور مذہبی پیشواؤں کا واسطہ ظواہر سے۔ لیکن انسان کی حقیقی زندگی اس کے "باطن" کی زندگی ہے۔ اصل مقصود اس زندگی کی تطہیر و تزکیہ ہے جو صرف مرشد کی اطاعت سے ممکن ہے۔ اسے تصوف یا مسلکِ خانقاہیت کہا جاتا ہے۔ اس مسلک کی بنیادی شرط یہ ہے کہ۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

یعنی مرشد کی اطاعت۔ بے عقل و غش اطاعت۔ بلا چون و چرا اطاعت۔ بغیر سوچے سمجھے اطاعت الٰہی اطاعت کہ اس کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال نہ ابھرنے پائے۔ یہ استبداد کی تیسری اور شدید ترین شکل تھی۔

ہماری ساری تاریخ (صدرِ اوّل کے بعد) اسی استبدادِ ثلاثہ کی داستانِ خونچکاں ہے اور یہ امت "کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری"

۳۔ قرآن کریم انسانی فکر کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور آسمانی راہنمائی کا ایک بنیادی مقصد اس کی فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنا بتاتا ہے۔ سورہ تغابن میں ہے۔ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ۔ یہاں جو واقعہ بھی ظہور میں آتا ہے۔ قانونِ خداوندی کے مطابق آتا ہے۔ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ۔ (۶۴/۱۱) جو شخص ان قوانین کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہے اس کی قوتِ فکر (قلب) کو ایسی راہ نمائی مل جاتی ہے جس سے وہ ان قوانین کی غرض و غایت کو بھی سمجھ لیتا ہے اور حوادث کے رخ سے آنے والے طوفانوں (حوادث) کا بھی اندازہ کر لیتا ہے۔ جس قوم کو اس قسم کی فکری صلاحیت نصیب ہو جائے وہ یقیناً امامتِ امم (قوموں کی لیڈر شپ) کی اہل قرار پا سکتی ہے۔ اسی قسم کی فکری جلا کو فراستِ مومنانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور حضرت علامہ نے (اپنے زیرِ نظر شعر میں) اسے مومن کی "آئینہ ضمیری" کہہ کر پکارا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی آئینہ ضمیری، حریتِ فکر و نظر ہی سے میسر آ سکتی ہے لیکن جس قوم کی فکری صلاحیتوں کو صدیوں کے استبدادِ سلطانی و ملائی و پیری نے مفلوج بلکہ مصلوب کر دیا ہوا ہے۔ یہ آئینہ ضمیری کہاں سے ملے گی۔ ایسی قوم کی تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا (۷/۱۷۹)

وہ دل و دماغ تو رکھتی ہے لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتی۔ آنکھیں رکھتی ہے لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتی۔ کان رکھتی ہے لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتی ـــ یہ قوم جہنم کے عذاب میں مبتلا ہوتی ہے۔

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق حضرت علامہ کے اس شعر کا مفہوم قرآن کریم اور تاریخ کی روشنی میں ـــ اور یہ ہے وہ انداز جس کے مطابق میں فکر و پیامِ اقبال کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

سوال نمبر ۲۔ علامہ اقبال نے نظم میں ارشاد فرمایا ہے۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی ـــــ یہ اُمت روایات میں کھو گئی

آپ یہی کچھ نثر میں لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ مسلمان انہیں تو عاشقِ رسولؐ اور رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اور عجمی سازش کو بے نقاب کرنے پر آپ سے ناراض و برہم ہیں۔ یہ تضاد کیوں ہے ؟

جواب:- اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں شاعر کو (SERIOUSLY) لیا ہی نہیں جاتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اسے محض خیالی یا تصوراتی دنیا کے خواب اور تفننِ طبع کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے فقرے آپ نے اکثر سنے ہوں گے کہ "یار! اُسے چھوڑو۔ وہ محض شاعری کرتا ہے" اس سے یہی مراد ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر جو کچھ زاہد اور دوسری طرف "شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود" کے متعلق صدیوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں اور لوگ اُسے مزے لے لے کر سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں، وہ ان میں سے کوئی ایک بات نثر میں کہیں اور پھر دیکھیں کہ ان کا حشر کیا ہوتا ہے؟ علامہ اقبالؒ کو بھی اس کا احساس تھا کہ شاعر کو لوگ (SERIOUSLY) نہیں لیتے۔ اس لئے وہ بار بار کہتے تھے کہ نہ میں شاعر ہوں، نہ جو کچھ میں کہتا ہوں اس سے شاعری مقصود ہے۔ لیکن ان کی اس تنبیہ سے کیا ہوتا ہے۔ لوگوں نے انہیں شاعر ہی سمجھا اور ان کے پیغام کے ساتھ وہی سلوک کیا جو شاعری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ حضرت علامہ قرآنی فکر کے متعلق جو کتاب (نثر میں) لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اگر وہ کتاب مرتب ہو جاتی تو اس سے اسلام اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں دنیا کے سامنے آ جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اور قوم ایک عظیم متاع سے محروم رہ گئی۔

میں (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآنی فکر کو نثر میں پیش کرتا ہوں اور لگی لپٹی بغیر پیش کرتا ہوں۔ اس لئے تمدن، تصوف، شریعت، کلام۔ غرضیکہ ہر گوشے سے اس کی مخالفت ہوتی ہے اور سخت مخالفت۔

اس مخالفت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت، پاکستان میں تھیاکریسی مسلط کرنا چاہتی ہے۔ اور میں پچیس سال سے مسلسل اس کی مخالفت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں ایک بے سر و سامان اور بے ساز و یراق انسان ہوں لیکن قرآن کی آواز اپنے اندر ایسی قوت رکھتی ہے (کیونکہ وہ دلائل و براہین پر مبنی ہوتی ہے اور سوچنے والے ذہنوں سے چپک جاتی ہے) کہ یہ حضرات اس سے خائف رہتے ہیں اور میرے خلاف طرح طرح کے الزامات تراش کر کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کی یہ آواز عام نہ ہونے پائے۔ اگر حضرت علامہ زندہ رہتے اور مملکت پاکستان کے آئین و ضوابط کی تدوین اور اسلامی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں وہی کچھ کہتے جو میں کہہ رہا ہوں تو آپ دیکھتے کہ ان کی بھی کس طرح مخالفت ہوتی! (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے خلاف ان کے ایک بیان پر جس طرح بھڑوں کا چھتہ چھڑ گیا تھا، اس کے تو آپ بھی عینی شاہد ہوں گے۔

سوال نمبر ۳:- یہ تو آپ کی نظروں سے یقیناً گزرا ہوگا کہ مودودی صاحب نے احادیث کو فرسودہ ذخیرہ تک کہا ہے اور آپ سے کہیں زیادہ سخت الفاظ اس ضمن میں تحریر کئے ہیں۔ آپ کے نزدیک فرمودات رسولؐ ضعیف، موضوع اور وضعی ہو ہی نہیں سکتے اور آپ ایسی روایات کو حدیث رسولؐ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ حیرت ہے کہ جہانِ مُلّا میں آپ کو منکرِ حدیث کہا جاتا ہے۔ کیا مودودی صاحب کی ایسی تحریروں

پر مولوی صاحبان کی نگاہ نہیں پڑتی ؟

جواب :- حدیث کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ احادیث کے متداول مجموعوں میں صحیح اور وضعی ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ ان میں جو روایات قرآن کریم کے احکام اور تعلیم کے خلاف ہوں یا جن سے حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہو یا جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہو، ان کے متعلق میں کہتا ہوں کہ وہ وضعی ہیں۔ وہ رسول اللہؐ کی حدیثیں ہو نہیں سکتیں۔ میں ایسی حدیثوں کو صحیح ماننے سے انکار کرتا ہوں یہ ہے میرا "انکارِ حدیث" جس کے متعلق طرح طرح کے افسانے تراشے جاتے ہیں جہاں تک مودودی صاحب کا تعلق ہے، اتنا ہی نہیں کہ وہ احادیث کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کا مسلک مرزا غلام احمد قادیانی کے مسلک سے ملتا جلتا ہے۔ مرزا صاحب کا مسلک یہ تھا کہ۔

> جو شخص خدا سے حکم ہو کر آیا ہے، اسے اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے، خدا سے علم پا کر قبول کرلے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱)

چنانچہ اس مسلک کے مطابق مرزا صاحب اپنے مطلب کی حدیثوں کو صحیح قرار دیکر بطور سند پیش کر دیتے اور جو حدیثیں ان کے مطلب و مقصد کے خلاف جاتیں انہیں مسترد کر دیتے تھے۔ یعنی احادیث کے رد و قبول کا معیار ان کا اپنا فیصلہ تھا۔

مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ:

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے عائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین نبوت کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدی میں گم اور اس کی بصیرت، بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔

اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوتی ہے وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔ (تفہیمات حصہ اول ص ۲۳۳-۲۳۴)

اس معیار کے مطابق مودودی صاحب بھی جس حدیث کو مفید مطلب پا لیتے ہیں اسے صحیح قرار دیتے ہیں جسے اپنے مطلب اور مقصد کے خلاف دیکھتے ہیں اسے رد کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مزاج شناسِ رسولؐ کو (جو ان کے متبعین کے نزدیک خود مودودی صاحب ہیں) اس کا بھی اختیار دیتے ہیں کہ جہاں کوئی حدیث نہ ملے وہ یہ کہہ دے کہ اگر آج رسول اللہ موجود ہوتے تو آپ یہ فیصلہ دیتے، آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب کس مقام سے بول رہے ہیں؟ شروع شروع میں مودودی صاحب کے اس قسم کے خیالات کی بنا پر مولوی صاحبان نے انہیں منکر حدیث بھی قرار قرار دیا اور ان کے خلاف کفر کے فتوے بھی لگائے، لیکن اس کے بعد جب ان کے (مودودی صاحب) کے ہاں زر و سیم کے چشمے اُبل پڑے اور ان کے پراپیگنڈے کی مشینری منظم اور مستحکم ہو گئی تو ان حضرات نے اپنے ہونٹ سی لئے۔ میرے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں اس لئے میرے خلاف جو ان کے جی میں آئے، کہتے چلے جاتے ہیں۔ (اسکی بنیادی وجہ سوال ۲ کے جواب میں عرض کر چکا ہوں)۔

سوال نمبر ۴۔ طلوعِ اسلام میں "شاہد عادل" نے مودودی صاحب کی تفہیم القرآن پر جو تنقید و جرح کی ہے۔ کیا آپ اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو مودودی صاحب کی قرآن فہمی اور دین شناسی کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

جواب۔ "طلوعِ اسلام" میں "شاہدِ عادل" کے قلم سے مودودی صاحب کی تفسیر پر جو تفصیلی تنقید شائع ہوئی ہے علمی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا ہے اور یہ تقاضے دیگر گوشوں کی طرف سے بھی موصول ہو رہے ہیں کہ اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ یہ تجویز ادارہ طلوعِ اسلام کے زیرِ غور ہے۔ لیکن اس تفسیر پر تنقید تو اس موضوع کا صرف ایک گوشہ ہے۔ مودودی صاحب نے جس بری طرح سے اسلام کو مسخ کیا ہے، اس کی نقاب کشائی کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ جس طرح براہین احمدیہ کی اشاعت کے وقت مسلمان مرزا غلام احمد سے دھوکا کھا گئے تھے۔ اسی طرح وہ مودودی صاحب سے بھی دھوکا کھا رہے ہیں۔ جب ان کا پراپیگنڈہ ختم ہوا اور ایسی فضا پیدا ہو گئی جس میں مسلمانوں نے ان کے متعلق ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کیا تو انہیں نظر آئیگا کہ یہ صاحب مرزا صاحب سے بھی کہیں زیادہ اسلام کو نقصان پہنچا گئے ہیں ـــ طلوعِ اسلام میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی خطرہ کی نشاندہی کے لئے ہے۔

سوال نمبر ۵۔ کیا کسی فرقہ کی اکثریت کو معیارِ حق و صداقت ٹھہرا کر نظامِ اسلام اسکی فقہ کے مطابق اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آج ایک فرقہ کی اکثریت ہے تو امکان یہ بھی ہو سکتا ہے کل دوسرے فرقہ کی اکثریت ہو جائے پرسوں اترسوں تیسرے کی۔ کیا کثرت و قلت کے معیار کو قرآن حق ماننے کے لئے تیار ہے۔ یا اسلامی نظام کے

لئے حق و باطل کا معیار میزانِ خداوندی (قرآن) ہے۔

جواب - قرآن کریم کی رُو سے حق، حق ہوتا ہے خواہ اسکی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے اور باطل، باطل خواہ اس کے حق میں ساری دنیا ہو۔ جب نبی اکرمؐ نے پہلی مرتبہ حق کی آواز بلند کی اور فرمایا کہ (انا) اول المسلمین (میں) وہ حق کی آواز تھی حالانکہ اُس وقت (دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق) اس آواز کا (SECOND) کہنے والا بھی ہنوز کوئی نہ تھا اور (اکثریت ہی نہیں بلکہ) ساری دنیا اس کے خلاف تھی۔ اکثریت، کو معیارِ حق و باطل قرار دینا، مغربی نظامِ جمہوریت کا وضع کردہ تصور ہے جو یکسر باطل اور اسلام کی نقیض ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے معیارِ حق و باطل، خدا کی کتاب ہے اور کفر و ایمان میں خطِ امتیاز۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

میں نے اس موضوع پر اپنے اس خطاب میں جسے میں یوم آزادی (اگست ۱۹۷۳ء) کی تقریب پر پیش کیا ہے، تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہ خطاب ــــ کیا ہم آزاد ہیں ــــ کے عنوان سے طلوعِ اسلام کی ستمبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمالیجئے۔ میرے خیال میں ہمارے ہاں کے مختلف فقہی فیصلوں کو (خواہ وہ کسی فرقہ سے متعلق ہوں) قرآنی کسوٹی پر پرکھ لینا چاہیئے۔ جو اصولاً اس کے مطابق اور جزئی طور پر دورِ حاضر میں ممکن العمل ہوں۔ انہیں اختیار کر لینا چاہیئے۔ جو اس کے خلاف ہوں، انہیں مسترد کر دینا چاہیئے۔ اسلامی نظام میں فقہ کی تدوین کا کام مسلسل جاری رہتا ہے اور اصول اس کا وہی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

سوال ۶ - آپ نے قرآن کے نظامِ ربوبیت کو صاف و شفاف انداز میں آمیزش کے کیچڑ سے نکال کر اچھی صورت میں مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ سوشلزم، کمیونزم کی طرف تو لپک رہے ہیں، ان میں اسے قبول اور برپا کرنے کے رجحانات کیوں نہیں پائے جاتے؟

جواب - میں قرآن کے صرف معاشی نظام کو پیش نہیں کرتا، اسے بحیثیت ایک کلی ضابطۂ حیات کے پیش کرتا ہوں جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے، معاشی نظام اس کا صرف ایک گوشہ ہے۔ قرآنی نظام کو یا تو بالکلیہ تسلیم اور اختیار کرنا ہوتا ہے یا بالکلیہ چھوڑ دینا۔ وہ اسکی اجازت نہیں دیتا کہ اسکے کسی ایک گوشے کو اختیار کر لیا جائے اور دوسرے گوشوں کو چھوڑ دیا جائے۔ جب اُسے بحیثیت کلی نظام اختیار کیا جائے تو وہ انسانی سیرت و کردار کی حدود بندی کرتا ہے اور انہیں اقدارِ خداوندی کا پابند قرار دیتا ہے۔ ان حضرات پر یہ پابندیاں گراں گذرتی ہیں۔ اس کے برعکس سوشلزم یا کمیونزم کسی غیر متبدل ابدی ضابطۂ اخلاق و اقدار کے قائل ہی نہیں اس لئے وہ اپنے متبعین پر کسی قسم کی اخلاقی پابندی کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ "کھلی چھٹی" جس کی وجہ سے یہ حضرات سوشلزم اور کمیونزم کو ترجیح دیتے ہیں ورنہ جہاں تک خالص معاشی نظام کا تعلق ہے، قرآنی نظام سوشلزم یا کمیونزم کے نظام سے بھی کہیں آگے جاتا ہے۔

سوال ۷ - کیا ایک مسلمان کمیونسٹ اور ایک کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے؟

جواب:- کمیونزم ایک معاشی نظام ہی نہیں، ایک نظریۂ زندگی ہے جس کی رُو سے، خدا، وحی، رسالت، آخرت، مستقل اقدار، سب سے انکار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ اس نظریۂ زندگی کا ماننے والا مسلمان ہو سکتا ہے، نہ کوئی مسلمان اس نظریہ کو ماننے کے بعد مسلمان رہ سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جو طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ۔ لیکن اس باب میں ایک خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم نے دیکھا یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان محض انقلابی بننے کے چاؤ میں اپنے آپ کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ کہنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کمیونزم یا سوشلزم کا فلسفۂ زندگی کیا ہے۔ ایسے نوجوانوں کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس امر کا بہ تحقیق معلوم کر لینا ضروری ہو گا کہ ایمانیات کے متعلق ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یونہی مولوی صاحبان کی طرح فتوے صادر نہیں کر دینا ہو گا۔

سوال نمبر ۸:- آپ کے نزدیک "روحانیت" سے کیا مراد ہے؟

جواب:- "روحانیت" تصوف کی اصطلاح ہے اور تصوف، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، "اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے"۔ قرآن اور حدیث، بلکہ صدرِ اوّل کے لٹریچر میں اس کا نشان تک نہیں ملتا۔ بعد میں جب اسلام کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو مسلمانوں نے اس قسم کے تصوّرات غیروں سے مستعار لے کر انہیں اپنے مذہب کا جزو بنا لیا۔ دین کا مقصود، انفرادی طور پر سیرت و کردار کی پاکیزگی اور بلندی اور اجتماعی طور پر اقدار و قوانینِ خداوندی پر مبنی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کریم نے اور تو اور خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے متعلق بھی کسی "مقامِ روحانیت" کا ذکر نہیں کیا۔ آپؐ کے متعلق یہی ارشاد فرمایا کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ (۶۸/۴) "یہ حقیقت ہے کہ آپ انسانی اخلاق کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں"۔ قرآن مجید نے "رہبانیت" کے متعلق واضح الفاظ میں کہا تھا کہ یہ انسانوں کا خود وضع کردہ مسلک ہے، خدا کا تجویز فرمودہ نہیں۔ ہم نے "رہبانیت" کا نام بدل کر "تصوف" رکھ لیا۔ اور اسے دین ہی نہیں "مغزِ دین" قرار دے دیا۔ اور اس طرح دین کا تصوّرِ اجتماعیت ختم کر کے اسے ذاتی اور انفرادی نجات کا ذریعہ بنا دیا۔ یہ اسلام کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی۔ اس کے لئے (زیادہ نہیں تو) کم از کم ارمغانِ حجاز میں وہ نظم دیکھئے جس کا عنوان ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ اور جو میرے نزدیک حضرت علامہ کے فکر و پیغام کا ماحصل ہے۔ اس میں ابلیس اپنے مشیروں کو ہدایت کرتا ہے کہ مسلمان کو بدستور سلائے رکھنے کا طریق یہ ہے کہ:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے ! تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام ! چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

اس مقصد کے لئے نسخہ یہ ہے کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے ! پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کو "روحانیت" کہا جاتا ہے اور (آپ کو شاید علم نہ ہو) راقم الحروف یہ منازل خود طے کر چکا ہے۔ اس لئے

"قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید"

سوال نمبر ۹:- کیا حضورِ اقدس و اعظمؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے مراد زندگی کا وہ نمونہ یا ماڈل ہے جس کو تمام

مسلمان اختیار کر سکتے ہیں یا کچھ اور ہے ؟

جواب - ہاں! حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے یہی مراد ہے۔ حضورؐ کا وہ خُلقِ عظیم، جس کی طرف میں نے سوال نمبر ۸ کے جواب میں اشارہ کیا ہے، حضورؐ کی سیرت ہے اور جو شرف و مجد انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ حضورؐ کی یہ سیرت، مسلمانوں ہی کے لئے نہیں، تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک بہترین، بلندترین، حسین ترین، مکمل ترین، اور عدیم النظیر ماڈل ہے۔ بالفاظ دیگر۔ یوں کہئے کہ جسے قرآن نے صبغۃ اللہ (خدا کا رنگ) کہا ہے۔ اس کا محسوس مظہر، سیرتِ محمدیہ ہے۔ اور سیرتِ محمدیہ کا اتباع مقصودِ انسانیت۔

سوال نمبر ۱۰ - حضرت علامہؒ نے اپنے آخری بیان کے آخری پیراگراف میں جو کہا تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم خیالوں (وطنی نظریہ کے حاملین) اور قادیانیوں دونوں نے حضورؐ کی کامل سیاست (؟) سے انکار کیا ہے اور دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ آپ حضرت علامہؒ کے اس فرمان کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب - حضرت علامہؒ نے اپنے اس بیان میں ایک عظیم حقیقت کی نشاندہی کی ہے۔ آپ نے کہا یہ ہے کہ دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن اس دین کی اقامت کے لئے امت کی تشکیل اسی رسول پر ایمان اور اس کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ملتا ہے۔ اس جہت سے مسلمان دینِ خداوندی کے متبع اور اُمّتِ محمدیہ کے افراد ہیں۔ اگر کوئی شخص، نبی اکرمؐ کے بعد کسی اور نبوت پر ایمان لے آئے تو وہ اُمّتِ محمدیہ کا فرد نہیں رہتا۔ اس نئے نبی کی امت کا فرد بن جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اسلام میں معیارِ قومیت، ختمِ نبوت پر ایمان کا اشتراک ہے۔

لیکن ہمارے زمانے میں ختمِ نبوت کی مہر ہی نہیں ٹوٹی، یہ نظریہ بھی وضع اور اختیار کیا گیا۔ کہ معیارِ قومیت، اشتراکِ وطنیت ہے، اس نظریہ کا عملی نتیجہ بھی وہی ہے جو ختمِ نبوت کے انکار کا ہے۔ دونوں میں، معیارِ قومیت، ختمِ نبوت نہیں رہتا، کچھ اور قرار پا جاتا ہے۔

اور اب تو ہمارے ہاں (خیر سے) معیارِ قومیت، اشتراکِ وطنیت ہی نہیں، نسل، زبان بلکہ صوبائی اشتراک کو بھی معیارِ قومیت بنایا جا رہا ہے۔

خدا ایں سخت جاں را یار باد کہ افتاد است از بامِ بلندے

اُمّتِ محمدیہ، کا اُمت واحدہ ہونا لازمی ہے کیونکہ اس میں معیارِ قومیت ایک ہوتا ہے۔ لیکن جب معیارِ قومیت مختلف اور متعدد ہوں گے تو امتیں (قومیں) بھی الگ الگ اور متعدد ہو جائیں گی — خواہ یہ مختلف "نبیوں" کی طرف نسبت سے ہو اور خواہ مختلف وطنوں، نسلوں، زبانوں کی نسبت سے۔ یوں انکارِ ختمِ نبوت اور نیشنلزم (وطنیت) کا عملی نتیجہ یکساں ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر ۱۱ - کیا طلوعِ اسلام کا اجراء پہلے ۱۹۳۵ء میں (علامہؒ کی خواہش پر) جناب سید نذیر نیازی نے کیا تھا اور ۱۹۳۸ء میں حضرت علامہؒ نے آپ کی اہلیت و قابلیت اور صلاحیت کو بھانپ کر اس کی ادارت جناب کے سپرد کی تھی اور اسے جاری کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی ترتیب دی تھی۔ جس کے دو ممبر یا حسن اختر مرحوم اور مودودی صاحب بھی تھے ؟

جواب - طلوع اسلام (دورِ اوّل) حبیب مکرم سیّد نذیر نیازی صاحب نے دہلی سے جاری فرمایا جس کا پہلا پرچہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس کا دوسرا پرچہ فروری ۱۹۳۶ء میں شائع کرنے کے بعد نیازی صاحب لاہور منتقل ہو گئے۔ جہاں سے انہوں نے تین پرچے شائع کئے۔ آخری پرچہ مئی ۱۹۳۷ء کا تھا جس کے بعد اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ علامہ اقبالؒ اس کے احیاء کے لئے متردد تھے اور نذیر نیازی صاحب اس کے لئے کوشاں، لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی "ڈائری" میں کیا ہے جو حال ہی میں "اقبال کے حضور" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں کسی ایسی کمیٹی کا ذکر نہیں جو ناچیز حسن اختر (مرحوم) اور مودودی صاحب پر مشتمل تھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے مودودی صاحب کا اس سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں حلقۂ اقبالؒ میں چنداں اہمیت حاصل نہیں تھی۔ نیازی صاحب کی یہ ڈائری بڑے سائز کے قریب پان سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس میں حضرت علامہ کے معمولات سے متعلق (۱۹۳۸ء کے ابتدائی تین ماہ کے) کوائف و حوادث بڑی تفصیل سے درج ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعہ تک اور قریب ہر اس شخص کے متعلق جو اس دوران میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن آپ یہ جان کر متعجب ہونگے کہ اس ضخیم اور مفصل ڈائری میں مودودی صاحب کا نام صرف ایک جگہ آتا ہے اور وہ بھی حضرت علامہ کی نسبت سے نہیں۔ اس میں ایک جگہ آقائے مرتضیٰ احمد خاں میکش (مرحوم) کا ذکر آگیا ہے اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے جماعت احمدیہ کے خلاف بکثرت مضامین لکھے اور مودودی صاحب سے بھی سلسلہ نزاع جاری رکھا' (صفحہ ۲۲۲) مودودی صاحب کا اور کہیں کسی سلسلہ میں نام تک نہیں آیا، حالانکہ یہ وہی زمانہ تھا جب یہ حیدر آباد (دکن) سے منتقل ہو کر دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ بنا بریں میں نہیں سمجھتا کہ نیازی صاحب کے طلوع اسلام سے متعلق کسی کمیٹی میں (اگر کوئی ایسی کمیٹی وجود میں آئی بھی تھی تو) مودودی صاحب شامل تھے۔

جب نیازی صاحب والا طلوع اسلام دوبارہ جاری نہ ہو سکا تو اپریل ۱۹۳۸ء میں، حضرت علامہ کی آرزو اور ان کے مشن کی تکمیل کے لئے موجودہ طلوع اسلام، دہلی سے، آزادانہ جاری کیا گیا۔ اس کے لئے کوئی کمیٹی نہیں بنائی گئی تھی۔

سوال نمبر ۱۲ - کیا ان اندوہناک لمحات اور خوفناک و خطرناک حالات میں ملتِ پاک کے بچاؤ کی کوئی تدبیر آپ کے ذہن میں ہے؟ کیا اس کی بازآفرینی کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ اگر ہو سکتی ہے تو عملی پروگرام کیا ہو سکتا ہے؟

جواب - اس کی بازآفرینی کی صورت تو ہو سکتی ہے لیکن قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ آغازِ کار عملی پروگرام سے کرنا چاہتی ہے اور قرآن حکیم ابتداءً فکری پروگرام سے کرتا ہے۔ وہ فکری یا نفسیاتی تبدیلی کے بغیر عملی پروگرام کا تقاضا کرنے والوں سے برملا کہتا ہے کہ یہ طریق کار یکسر غلط ہے۔ یاد رکھو! اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔ (۱۳/۱۱) اس آیہ جلیلہ کے الفاظ پر غور

کیجئے۔ یوں تو خدا کی ہر بات حتمی اور یقینی ہوتی ہے لیکن جس بات پر اس نے زور دینا ہوتا ہے اسے (ہمیں سمجھانے کی خاطر) حتمی الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس آیت میں اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو۔ گوش ہوش سے سُن لو۔ یہ یقینی اور حتمی بات ہے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا کرے، خدا اس قوم کی حالت کو ہرگز ہرگز نہیں بدلتا۔ اگر ہمارا قرآن پر فی الواقعہ ایمان ہوتا تو ہم فکری اور نفسیاتی تبدیلی کے بغیر تغیرِ احوال کا خیال تک بھی دل میں نہ لاتے۔ لیکن ہم خدا کے خلاف محاذ کھڑا کئے ہیں جو اس سے (معاذ اللہ) کہہ رہے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ داخلی تبدیلی کے بغیر خارجی تبدیلی ناممکن ہے۔ ہم تمہیں ایسا کر کے دکھا دینگے! خدا کیخلاف اس نبرد آزمائی کا نتیجہ ظاہر ہے۔ میں نے تشکیل پاکستان کے بعد پہلی بات یہ کہی تھی کہ موجودہ قوم جیسی کیسی بھی ہے، اسکے ذمے یہ فریضہ عائد کرو کہ یہ اس خطۂ زمین کو محفوظ رکھیے۔ اور آنے والی نسلوں میں فکری تبدیلی کا تفصیلی پروگرام مرتب کرو یعنی ان کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام کرو۔ ارباب قوم نے اس مشورہ کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا۔ جب حالات بگڑنے لگے تو قوم کیطرف سے "عملی پروگرام" کے تقاضے شروع ہو گئے۔ میں نے ہر تقاضا کے جواب میں قرآن کی اسی تاکید و تنبیہہ کو دھرایا۔ جواب ملا کہ یہ تو بڑا لمبا پروگرام ہے۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ۔۔ اور کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ میری مشکل یہ تھی کہ مجھے قرآن سے کوئی (SHORT CUT) نہیں ملتا تھا۔ اس لئے میں اُس کے تجویز کردہ پروگرام کے سوا کوئی پروگرام بتا نہیں سکتا تھا پچیس سال سے یہی ہو رہا ہے۔ جوں جوں حالات ابتر ہوتے جاتے ہیں، حساس قلوب کی تڑپ اور خلش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور "عملی پروگرام" کے تقاضے شدید سے شدید تر! اب "خدا کے خلاف محاذ آرائی" کا نتیجہ (آپ کے الفاظ میں) اس قدر ہولناک۔ خطرناک اور اندوہناک بن کر سامنے آرہا ہے کہ ہم پر کپکپی طاری ہو رہی ہے اور مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے۔ اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خود اس خطۂ زمین کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔ ان حالات میں، پہلا کام تو یہ ہے کہ اس خطۂ زمین کو کسی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ یہ کام ارباب نظم و نسق ہی کے کرنے کا ہے۔ میرے آپ کے بس کا نہیں۔ ہم حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں لیکن اس کے لئے موثر پروگرام وہی تجویز کر سکتی ہے۔ اگر (اور جب) اس خطۂ زمین کی حفاظت کیطرف سے اطمینان ہو جائے تو پھر طریق کار وہی اختیار کرنا ہوگا۔ جو قرآن نے بتایا ہے۔ ہم نے خدا سے ٹکر لینے کا نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ اگر ہم اب بھی اپنی روش نہیں بدلتے تو ہلاکت سامنے کھڑی ہے۔ ہماری خاطر خدا اپنے قانون کو بدلنے سے رہا۔ وہ کسی کی خاطر بھی اپنا قانون نہیں بدلا کرتا۔ قانون اس کا یہ ہے کہ "جب تک کوئی قوم اپنے اندر فکری اور نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ اسکی خارجی دنیا میں تغیر نہیں ہو سکتا" والسلام

کیا ہم آزاد ہیں؟ اس خطاب کا علیحدہ پمفلٹ بھی شائع ہو رہا ہے۔ قارئین طلوع اسلام زیادہ سے زیادہ تعداد میں منگا کر اس کی اشاعت عام کریں۔ قیمت صرف ۵۰ پیسے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ "طلوع اسلام"

باب المراسلات

اغلاط سے پاک قرآن مجید

محترمی - السلام علیکم!

جناب مولانا کوثر نیازی صاحب مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات کی تحریک پر قومی اسمبلی نے مورخہ ۲۳ کو قرآن حکیم کی صحیح طباعت کے مسودہ قانون کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا ہے۔ مولانا کوثر نیازی صاحب نے بل پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

> اس امر کی عام شکایت ہے کہ پاکستان میں طبع کردہ قرآن مجید کے نسخے اغلاط سے پُر ہوتے ہیں۔ اس بات کا ذکر سب سے پہلے ایک انڈونیشی مسلمان نے کیا جس نے پاکستان سے گزرتے ہوئے یہاں سے قرآن پاک کا ایک نسخہ خریدا تو معلوم ہوا کہ اس میں سینکڑوں آیات حذف تھیں۔ اور جب وزارت اطلاعات نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا تو پاکستانی شہریوں نے قرآن پاک کے کئی نسخے فراہم کئے جن میں طباعت میں بہت غلطیاں تھیں اور ایک نسخہ میں تو کتابت اس قدر غلط تھی کہ ایک ہی صفحہ میں ۳۲ اغلاط نکلیں۔ (امروز ملتان مورخہ ۲۳)

ظاہر ہے اب اس قانون کی رو سے قرآن حکیم کی صحیح طباعت کا بندوبست کیا جائے گا۔ تاکہ کتابت اور املا کی غلطیاں دور کر کے متفق علیہ نسخہ تیار کیا جائے جس سے متعدد نسخوں کی کتابت ہوگی۔ اس کے لئے ایک بورڈ کی تشکیل بھی ہو چکی ہے جو اس کام کو سرانجام دیگا۔ یہ ایک مستحسن اقدام ہے جس کے لئے وزیر موصوف مبارک کے مستحق ہیں۔

اگرچہ یہ کام بھی اپنی جگہ خاص اہمیت کا حامل ہے لیکن اس سے کہیں اہم اور قابل توجہ ایک اور مسئلہ ہے جس کا تعلق قرآن حکیم کے مروجہ تراجم سے ہے۔ اس وقت قرآن حکیم کے جتنے بھی تراجم موجود ہیں ان میں سے ایک کا ترجمہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ ہمارے ہاں کی ننانوے فیصد آبادی عربی زبان نہیں جانتی اس لئے قرآن مجید کے سمجھنے کے لئے ان کا انحصار لامحالہ ترجمہ پر ہوتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر قاری کو ایک ہی لفظ یا آیت کا ترجمہ ایک نسخہ میں کچھ ملے اور دوسرے میں کچھ تو وہ اُلجھن میں پھنس جائے گا اور یقینی طور پر نہیں کہہ سکے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے صحیح منشا کو سمجھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کہا تھا کہ قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے کی ایک بنیادی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد معنوی اختلاف تھا۔ لیکن جب

معنوی اختلافات کا یہ عالم ہو کہ قرآن مجید کے کسی ایک لفظ یا ایک آیت کا ترجمہ دوسرے ترجمہ سے مختلف ہو، تو اس سے بڑھ کر تضاد اور کیا ہوگا؟ میں یہاں تفسیری اختلافات کا ذکر نہیں کر رہا کیونکہ تفسیر میں مفسر کے اپنے خیالات اور دیگر متعدد مؤثرات کا دخل ہوتا ہے۔ لیکن ترجمہ میں تو یہ بات نہیں ہونی چاہیئے۔ میرے لئے یہ تو ناممکن ہے کہ میں قرآن مجید (مترجم) کے تمام متداول نسخوں میں ان جملہ مقامات کی نشاندہی کر سکوں۔ جن میں ترجمہ کا اختلاف ہے۔ میں نمونہ کے طور پر چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۔ (۱-۷)

(ا) ہم کو سیدھے رستے چلا اُن لوگوں کے رستے پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔ نہ اُن کے جن پر غصّے ہوتا رہا اور نہ گمراہوں کا۔ (ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری)

(ب) تبلا ہم کو راہ سیدھی راہ اُن لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا جن پر تیرا غصّہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (مرحوم)

دونوں ترجموں کا اختلاف بظاہر غیر محسوس سا ہے لیکن ان میں جو معنوی تضاد ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔

(۲) وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (۲-۱۰۲)

(ا) (اور اس علم کے پیچھے ہوئے) جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں۔
(ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن)

(ب) یہ بھی صحیح نہیں کہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اسطرح کی کوئی بات نازل ہوئی تھی۔ (ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد)

(۳) سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (۲-۱۴۲)

(ا) شتاب ہے کہ کہیں گے بیوقوف لوگوں میں سے کس چیز نے پھیر دیا ان کو قبلے اُن کے سے جو تھے وہ اوپر اُس کے۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب مرحوم)

(ب) اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو اُن کے قبلہ سے جس پر وہ تھے۔ (ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب)

(ج) بعض احمق لوگ یہ کہہ بیٹھیں گے کہ مسلمان جس قبلہ (بیت المقدس) کی طرف پہلے سے (سجدہ کرتے) تھے اس سے (دوسرے قبلہ کیطرف) مڑ جانے کا کیا باعث ہوا۔
(ترجمہ مولانا حکیم حافظ سید فرمان علی صاحب)

(د) بیوقوف (لوگ جو نہیں جانتے کہ بیت الحرام کی مرکزیت دائمی ہے۔ آپ کی ہجرت پر) بلاشبہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس قبلہ (مکہ معظمہ سے جہاں یہ تھے (دوسرے مرکز مدینہ کی طرف) کس نے موڑ دیا ہے۔ (ترجمہ بلاغ القرآن)

(س) اب کہیں گے بے وقوف آدمیوں میں سے یعنی ملت ابراہیمؑ سے اعراض کرنے والے (یہود اور

نصاریٰ) کہنے لگے کہ ہم کو حضرت ابراہیمؑ کے قبلہ سے جو ہمارا قبلہ قدیمی تھا جس پر ہم قدیم سے تھے کس نے پھیر دیا۔ (ترجمہ سید محمد شاہ گجراتی (مرحوم))

(۴) وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ (۲/۲۴۰)

(ا) اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے۔ (ترجمہ شیخ الہند مولینا محمود الحسن صاحب)

(ب) اور تم میں سے جو لوگ روک لئے جائیں (یعنی لاپتہ ہو جائیں) اور وہ بیویاں چھوڑ جائیں ان کی بیویوں کے لئے حکم ہے کہ انہیں ایک سال تک ضروریات زندگی مہیا کی جائیں اور انہیں ان کے گھروں سے نکالا نہ جائے۔ (ترجمہ بلاغ القرآن)

(۵) مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶)

(ا) جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر۔ (ترجمہ شیخ الہند مولینا محمود الحسن صاحب)

(ب) نہیں منسوخ کرتے ہم کسی (شیطانی) نشانی کو یعنی ترک کروا دیتے ہیں تو (محکمیت میں) اس سے بہتر نشانی لاتے ہیں اور (مفہوم) میں اس جیسی (کسی کی کوئی آیت صحیح انداز اور پیمانوں کے خلاف ہوتی ہی نہیں کہ اُسے نازل کرنے کے بعد پھر منسوخ کرنا پڑے) (بلاغ القرآن)

(۶) قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا۔ (۲/۲۶۰)

(ا) فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے پھر اُن کو ہلا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا۔ پھر اُن کو بلا۔ چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے۔

(ترجمہ شیخ الہند مولینا محمود الحسن صاحب)

(ب) خدا نے فرمایا کہ چار جانور پکڑ کر اپنے پاس منگا لو (اور ٹکڑے ٹکڑے کرا دو) پھر اُن کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دو۔ پھر اُن کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔

(ترجمہ مولینا فتح محمد جالندھری)

(ج) چار پرندے لے پھر انہیں اپنے ساتھ مانوس کر لے پھر ٹھہرا ان چاروں میں سے ایک ایک پرندہ ہر ایک پہاڑ پر۔ پھر انہیں آواز دے تیرے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔

(ترجمہ بلاغ القرآن)

(۷) اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ (۱۶/۱۲۵)

(ا) اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ۔

اور بہت ہی اچھے طریقے سے اُن سے مناظرہ کرو۔ (مولینا فتح محمد جالندھری)

(ب) بُلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سُنا کر بھلی طرح اور الزام دے اُن کو جس طرح بہتر ہو۔ (شیخ الہند مولینا محمود الحسن صاحب)

ملاحظہ کیا آپ نے کہ مندرجہ بالا تراجم ایک دوسرے سے کس قدر متخالف اور متضاد ہیں۔ حالانکہ عربی متن ایک ہی ہے۔ آپ قرآن مجید میں طباعت کی غلطیوں کی تصحیح تو کر دیں گے لیکن جب قرآن کے صحیح الفاظ پڑھنے والا ان کے ترجمہ کو دیکھے گا تو وہ اس کے اختلافات کو کون رفع کرے گا؟ الفاظ قرآنی کا صحیح پڑھنا نہایت ضروری ہے لیکن صحیح الفاظ پڑھنے والے کے سامنے اگر تراجم مختلف آئیں گے تو الفاظ کی صحت اسے کیا فائدہ دیگی؟

اس کے بعد ایک اور اہم سوال قرآن حکیم کے غلط اور گمراہ کُن تراجم سے متعلق ہے جس سے بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ اس مقصد کے لئے میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا اور اسے کافی سمجھونگا۔ کافی اس لئے سمجھوں گا کہ اس کا تعلق حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضورؐ کی ذات گناہوں سے پاک تھی۔ اس باب میں دو آراء ہی نہیں ہو سکتیں لیکن دیکھئے کہ قرآن مجید کی ایک آیت کے تراجم ہمیں کیا بتاتے ہیں۔ سورہ الفتح کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ
نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا ۙ (۴۸/۱-۲)

اب اِن آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

۱۔ بیشک اے نبی ہم نے تجھے ایک ظاہری فتح دی تاکہ جو کچھ تیرے گناہ اگلے ہوئے اور جو پیچھے رہے سب کو اللہ معاف فرما دے اور تجھ پر اپنا احسان پورا پورا کرے اور تجھے سیدھی راہ پر چلائے۔

(اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر۔ پارہ ۲۶ شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ کراچی)

۲۔ ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے اور پورا کرے تجھ پر اپنا احسان . . . . . .

(ترجمہ از شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل۔ لاہور)

۳۔ تحقیق فتح دی ہم نے تجھ کو فتح ظاہر تو کہ بخشے واسطے تیرے خدا جو کچھ ہوا تھا پہلے گناہوں تیرے سے اور جو کچھ پیچھے ہوا۔ اور تو کہ تمام کرے نعمت اپنی اوپر تیرے اور دکھلا دے تجھ کو راہ سیدھی۔

(ترجمہ از شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی شائع کردہ تاج کمپنی لاہور۔ کراچی)

۴۔ ہر آئنہ ما حکم کردیم برائے تو بفتح ظاہر عاقبت فتح آنست کہ بیامرزد ترا خدا آنچہ کہ سابق گذشت از گناہ تو و آنچہ پس ماند و تمام کند نعمت خود را بر تو . . . . . .

(ترجمہ از امام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی شائع کردہ نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ فریر روڈ کراچی)

۵۔ بلاشبہ ہم نے آپ کو کھلی فتح دی تاکہ آپ کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے اور اپنی نعمت آپ پر تمام کر دے ۔۔۔۔۔۔
(ترجمہ از مولانا احمد علی صاحب شائع کردہ شعبہ تالیف واشاعت انجمن خدام الدین دروازہ شیرانوالہ۔ لاہور)

۶۔ بیشک ہم نے تم کو کھلم کھلا فتح دی تاکہ اللہ تعالےٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے ۔۔۔۔۔۔
(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی، شائع کردہ اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی)

۷۔ بیشک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی تاکہ اللہ آپ کی (سب) اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے اور آپ پر احسانات کی اور زیادہ تکمیل کر دے اور آپ کو سیدھے راستے پر لے چلے۔
(ترجمہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور۔ کراچی)

۸۔ (اے محمدؐ) ہم نے تم کو فتح دی فتح بھی صریح و صاف تاکہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے اور تم کو سیدھے راستے چلائے۔
(ترجمہ از مولانا فتح محمد جالندھری، شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی)

۹۔ ہم نے فیصلہ کر دیا تیرے واسطے صریح فیصلہ تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے اور پورا کر دے تجھ پر اپنا احسان ۔۔۔۔۔۔
(ترجمہ از شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور کراچی)

۱۰۔ مارما ڈیوک کے انگریزی ترجمہ میں ہے۔

LO WE HAVE GIVEN THEE (O' MUHAMMAD) A SIGNAL VICTORY. THAT ALLA MAY FORGIVE THEE OF THY SIN THAT WHICH IS PAST AND THAT WHICH IS TO COME AND MAY PERFECT HIS FAVOUR UNTO THEE AND MAY GUIDE THEE ON A RIGHT PATH.

(ترجمہ از: MARMADUKE PICKTHALL
شائع کردہ۔ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی)

مندرجہ بالا تراجم کی رو سے نبی اکرمؐ (معاذ اللہ) ایک گنہگار کی حیثیت سے سامنے لائے گئے ہیں اور گنہگار بھی (معاذ اللہ) ایسے کہ ان کے گناہوں کو معاف کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ کو خاص اہتمام کرنا پڑا ۔۔۔ ان گناہوں

کو بھی جو آپؐ سے پہلے سرزد ہو چکے تھے اور انہیں بھی جو باقی ماندہ زندگی میں آپؐ سے سرزد ہونے والے تھے۔ میں پوچھتا ہوں ایک قلبِ سلیم رکھنے والے مسلمان سے کہ کیا ایک لمحہ بھر کے لئے بھی یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرمؐ نبی الرحمت (معاذ اللہ) ایسے ہی گنہگار تھے؟ اور کیا یہی کردار ہوتا ہے۔ اس ذاتِ مبارکؐ کا جس کی زندگی اور کردار کو اقوامِ عالم کے لئے ایک نمونہ قرار دیا گیا ہو۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (۳۳/۲۱)

تمہارے لئے رسول کی زندگی میں ایک بہترین نمونہ ہے۔

ازاں بعد میں "طلوع اسلام" کی وساطت سے مولانا کوثر نیازی صاحب سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کروں گا کہ کیا اُن کی نظر ان تراجم پر بھی پڑی ہے۔ جو میں نے اوپر درج کئے ہیں؟ اور اگر پڑی ہے تو کیا وہ ان سے متفق ہیں؟ اور اگر نہیں تو انہوں نے اس کا کیا انتظام کیا یا سوچا ہے کہ جس طرح کتابت کی اغلاط سے پاک قرآنِ حکیم کا متفق علیہ نسخہ تیار کرنے کے لئے قومی اسمبلی میں قانون وضع کیا گیا ہے، اسی طرح قرآن کریم کے تراجم کے اختلافات اور تضادات کو بھی ختم کیا جائے اور سب سے بڑی بات یہ کہ قرآن مجید کا کوئی ایسا ترجمہ شائع نہ ہونے پائے جس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آئے یا جس سے قرآن کی بنیادی تعلیم مجروح ہو جائے۔

آخر میں میں "طلوع اسلام" کی وساطت سے امید کرتا ہوں کہ محترم جناب مولانا کوثر نیازی صاحب مطلوبہ وضاحت سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔ نیاز مند۔ حسن عباس رضوی۔ نور محل روڈ۔ بہاولپور

(محترم کوثر نیازی صاحب کی مطلوبہ وضاحت تک طلوع اسلام اپنا تبصرہ محفوظ رکھتا ہے)

ایک ضروری وضاحت

طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۷۳ء میں شائع شدہ مقالہ ـــ انڈیا کے ساتھ ہمارے تعلقات ـــ کے ضمن میں، محترم میاں محمد شفیع صاحب (م۔ش) کی ڈائری کا ایک اقتباس درج کرنے کے بعد افسوس سے لکھا گیا تھا کہ میاں صاحب بھی ایک "برہمو سماجی اسلام" وضع کرنے کی تجویز پیش کر رہے ہیں۔

پرچہ شائع ہونے کے بعد میاں صاحب موصوف میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اسکا مطلب کچھ اور تھا۔ انہوں نے (بقول ان کے) کہا یہ تھا کہ صدر بھٹو جو بھارت سے تصادم کی پالیسی ختم کر کے تعلقات کی پینگیں بڑھا رہے ہیں تو اس کا آخری نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روس، بھارت اور پاکستان کے نظریات کے امتزاج سے ایک نیا نظریۂ حیات وضع کر لیا جائے! یعنی یہ ان کی (میاں صاحب کی) تجویز نہیں تھی بلکہ صدر بھٹو کے تازہ مسلک پر طنز تھا۔

میاں صاحب نے فرمایا تھا کہ طلوع اسلام میں ان کی طرف سے یہ وضاحت شائع کر دی جائے۔ سو یہ چند سطور طلوع اسلام میں اشاعت کی غرض سے تحریر ہیں۔

[پرویز]

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

لاہور میں — ہر اتوار - صبح ۸½ بجے بمقام ۲۵/ا گلبرگ ۲ - لاہور ٹیلیفون:- ۸۰۸۰۰	ملتان میں — ہر جمعہ - بعد از نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بمقام - دفتر شاہ منزل - بیرون پاک گیٹ ملتان ٹیلیفون:- ۲۰۷۱
سیالکوٹ میں — ہر اتوار صبح ۸½ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام چوہدری محمود دین - فی سٹال - کرسچن ٹاؤن بارہ پتھر - سیالکوٹ (۲)	کراچی میں — ہر اتوار صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ) بمقام دفتر بزم طلوع اسلام - ۴ فردوس مارکیٹ (بالمقابل بس سٹاپ - پہلی چورنگی - ناظم آباد - کراچی ۱۸) ٹیلیفون:- ۶۱۰۴۶۸

ماہنامہ طلوع اسلام و کتب ادارہ کے خریدار متوجہ ہوں

بسا اوقات خریداران و پیشگی کھاتہ داران ادارہ کے نام رقوم (جیسے چیک [CHEQUES] کے ذریعہ بھیجتے ہیں۔ جن کی ادائیگی لاہور کے مقامی بنکوں سے نہیں ہو سکتی۔ اور بیرون لاہور کے بنکوں سے یہ رقم حاصل کرنے میں فی چیک دو روپے زائد خرچ [BANK CHARGE] آتا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ خریداران ہر چیک پر [جو لاہور کے کسی مقامی بنک سے متعلق نہ ہو] بنک چارج کا اضافہ کر کے بھیجیں۔ ایسا نہ کرنے پر وصولی بقدر دو روپے کے کم محسوب ہو گی۔

(ناظم - ادارہ طلوع اسلام)

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دوکان

سٹینڈرڈ آٹو موبائلز

پر تشریف لائیے!

ڈیلرز:- موٹر پارٹس - ٹرک (ڈیزل) پارٹس
سپیشلسٹ:- ڈاج، بیڈفورڈ - لی لینڈ
لی - ایل - ایم - سی -

۱۳۵ - بادامی باغ ٹیلیفون 69012 لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

کیا ہم آزاد ہیں؟

نظامِ جمہوریت کا تجزیہ قرآنی روشنی میں

پرویز

درس خصوصی جو بتقریبِ "یومِ آزادی" ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء کو دیا گیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا ہم آزاد ہیں؟

عزیزانِ گرامی قدر۔ سلام و رحمت

اگست ۱۹۴۸ء میں جب ہم نے اپنی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی تو اس موضوع پر جو کچھ طلوعِ اسلام میں لکھا گیا تھا۔ وہ آج بھی ہر سوچنے والے ذہن کو اسی طرح دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ

> انسانی تاریخ کے اوراق پیچھے کو الٹتے جائیے۔ کاغذ سے دھاتوں اور دھاتوں سے پتھروں، محلات سے جھونپڑیوں اور جھونپڑیوں سے غاروں تک کے ازمنۂ مظلمہ میں پہنچ جائیے۔ اس کی تہذیب کے نقشے بدلتے اور اس کے تمدن کے خاکے مختلف ہوتے چلے جائیں گے۔ زبانیں بدلیں گی، خیالات بدلیں گے، طرزِ بود و ماند بدلے گا۔ اسلوبِ رفتار و گفتار بدلیگا لیکن اعصار و دہور کے اس تضاد و تباین اور اعصار و دیار کے اس اختلاف و تنوع میں ایک شے ہر جگہ اور ہر مقام پر مشترک اور غیر متبدل نظر آئے گی اور وہ یہ کہ انسانی شعور نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس نے ہمیشہ آزادی کی حمد و ستائش میں لاہوتی نغمے گائے ہیں۔ اس نے مختلف زمانوں میں مختلف خداؤں کو چھوڑا اور مختلف دیوتاؤں کو پوجا ہے۔ لیکن اس نے آکاش کی اس دیوی کے حضور بلا تخصیص زمان و مکان ہمیشہ شردھا کے پھول چڑھائے اور عقیدت کی شمعیں جلائی ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں آپ کو خدا تک کے منکرین مل جائیں گے لیکن کسی دور میں ایسا گروہ نہیں ملے گا جس نے آزادی کی عظمت سے انکار کیا ہو۔ انسانی تاریخ کیا ہے؟ اپنی اپنی آزادی کے تحفظ کی جد و جہد کی مسلسل داستان۔ مختلف ادوار میں نماردہ و فراعنۂ زمان اور اکاسرہ و قیاصرۂ دہر ہمیشہ اس کوشش میں رہے ہیں کہ کمزور اور ناتواں انسانوں کے سینے سے آزادی کی تمنا کو مٹا دیا جائے لیکن کمزور و ناتوان انسانوں نے اپنا سب کچھ لٹنا اور مٹنا گوارا کر لیا مگر آزادی کی حسین آرزوؤں کو اپنے دل کے کاشانوں سے کبھی مٹنے نہیں دیا۔ انہوں نے اس قربان گاہ پر اپنی عزیز ترین متاعِ حیات تک بھینٹ چڑھا دی لیکن اس کی آن پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ تاریخ کے ریگِ ساحل پر ان گنت موجیں آئیں اور مختلف نقوش کو بہا کر اپنے ساتھ لے گئیں لیکن اگر کوئی نقش ایسا تھا جو اس کی مسلسل تگ و تاز کے باوجود کبھی مٹ نہ سکا تو وہ اس بطلِ جلیل کا نقش تھا جس نے آزادی کے تحفظ کی خاطر جان دے دی۔ یا پھر اس ننگِ انسانیت

کا نام جس نے اپنوں کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھوں بیچ دیا۔ بہرحال دنیا نے ہر قوم کی عظمت کو آزادی
کے پیمانوں سے ماپا اور اسی کے معیاروں سے جانچا ہے۔ بایں نمط کہ آزادی کا لفظ دنیا کے ہر لغت
میں شرف و مجدِ انسانیت کے مرادف اور غلامی، ذلت و خواری کے ہم معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک حقیقت ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود کیا یہ امر باعثِ صد تعجب و موجبِ ہزار حیرت نہیں کہ آزادی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والا انسان آج تک یہ بھی متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑیئے اس باب میں خواص تک کی یہ کیفیت ہے کہ وہ آزادی کی کوئی متعین (DEFINITION) بھی نہیں دے سکے۔ میرے سامنے اس وقت پولیٹیکل سائنس کی ایک کتاب ہے جو نہایت مختصر ہونے کے باوجود خاصی شہرت کی حامل ہے یعنی (SOCIAL JUSTICE)۔ یہ عصرِ حاضر کے ممتاز علمائے سیاست کے چیدہ مقالات پر مشتمل ہے جنہیں پروفیسر (RICHARD B. BRANDT) نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس کے ایک مقالہ میں ہابس، سپنسر، کانٹ، ہل، بارکر، روسو، پامر، مارکس، انجلز، جیسے ممتاز مفکرین کی طرف سے پیش کردہ آزادی کی (DEFINITIONS) کو درج کیا گیا ہے اور اس کے بعد بدلائل و شواہد بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی ڈیفینیشن بھی جامع اور واضح نہیں۔ ان تمام فکری اختلافات کے باوجود ایک بات البتہ ہر جگہ اور ہر مقام میں بطورِ قدرِ مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اگر کسی قوم پر کوئی دوسری قوم حکمران ہو تو اُسے غلامی کہا جاتا ہے اور اپنی حکومت کو آزادی۔ چنانچہ ہندوستان میں تحریکِ آزادی سے بھی یہی مفہوم لیا گیا تھا۔ وہ تحریک سامراج (یعنی غیروں کی حکومت) کے مقابلہ میں سوراجیہ (اپنی حکومت) کے لئے جدوجہد تھی۔

ضمناً (مہاتما) گاندھی نے مسلمانوں میں رائج اصطلاح — حکومتِ خداوندی — کے مقابلہ میں رام راجیہ کی اصطلاح وضع کی تھی لیکن وہ چل نہیں سکی تھی۔ وہاں آزادی کے لئے سوراج ہی کی اصطلاح رائج رہی۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک غیر قوم یعنی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر ان کی جگہ اپنی حکومت قائم کی جائے۔ یہی تحریک آزادی کا منتہیٰ و مقصود تھا۔ اس جدوجہد میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کے

ہندوستان کی تحریکِ آزادی

بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور مذہبی راہنما مثلاً مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ شامل تھے اور اس جدوجہد کو جہاد قرار دیتے تھے۔ یہ جدوجہد ایسی تھی جس کے مقصد و منتہیٰ (یعنی غیروں کی جگہ اپنی قوم کی حکومت کے قیام) کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس میں دو آراء ہو نہیں سکتیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب یہ جدوجہد پورے زوروں پر تھی تو اس کے خلاف ایک آواز بلند ہوئی جس نے نہایت واضح الفاظ میں کہا کہ آزادی کا یہ مفہوم ہندو کے نزدیک صحیح ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک آزادی کا یہ مفہوم و مقصود درست قرار نہیں پا سکتا۔ ان کے نزدیک ازروئے اسلام آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ تحریکِ آزادی کے علمبرداروں نے اس آواز کی سخت مخالفت کی اور اس بنا پر چونکہ یہ کہا گیا تھا کہ اسلام کی رُو سے آزادی کا مفہوم اس سے مختلف ہے اس لئے اس آواز کی مخالفت میں علماء حضرات بڑی شد و مد سے آگے بڑھے۔ انہوں نے مشہور یہ کیا کہ یہ آواز انگریز کے وضع کردہ ناقوس کی صدائے بازگشت ہے اور مقصد اس سے آزادی کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکانا ہے۔ اس آواز کے بلند کرنے والے نے کہا کہ یہ الزام سراسر کذب ہے افترا ہے۔ جہاں تک انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا تعلق ہے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جہاں انگریزوں کا یہاں سے نکل جانا ہندوؤں کے نزدیک مقصود و منتہیٰ ہے مسلمانوں کے نزدیک یہ اس جدوجہد کا منتہیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ یہ

ان کے پیشِ نظر مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ یا سنگِ میل قرار پا سکتا ہے۔ یہ آواز یعنی حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی جنہوں نے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اعتراض کے جواب میں اپنے مفہوم کی وضاحت ان الفاظ میں کی تھی کہ:-

علامہ اقبالؒ کی آواز

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار الکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

اس کے جواب میں کہا گیا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جمہوری نظام نافذ کیا جائے گا۔ جسے نہ صرف یہ کہ

جمہوریت

اس وقت دنیا کا بہترین نظامِ سیاست تسلیم کیا گیا ہے، بلکہ وہ عین مطابقِ اسلام ہے۔ اس لئے اقبالؒ کا اعتراض اس کی قدامت پرستی، تنگ نظری اور تعصب پر مبنی ہے۔ اقبالؒ نے کہا کہ جس نظام کو تم بہترین نظام کہتے ہو آزادی کے عام تصور کی رو سے بھی اس کی حقیقت یہ ہے کہ

> ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام ✽ جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
> دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب ✽ تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور جہاں تک اس کے اسلامی ہونے کا تعلق ہے، سن رکھو کہ:

> جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
> جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

لہٰذا اسلامی نقطۂ نگاہ سے مغرب کا جمہوری نظام ویسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا نظامِ ملوکیت۔ اس نظام کے تحت آزادی کو ہم آزادی کہہ ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا ہندو کی تحریکِ آزادی کے خلاف مسلمان اسی طرح نبرد آزما رہیں گے جس طرح انگریز کی غلامی کے خلاف محاذ آرا رہیں۔ اقبالؒ کے بعد جب تحریکِ آزادی کی زمامِ قیادت قائد اعظمؒ نے اپنے ہاتھ میں لی تو وہ بھی مسلسل اور متواتر اقبالؒ کی پیش کردہ حقیقت کو دہراتے رہے۔ انہوں نے واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ:

> ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے، بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ..... مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشو و نما اور روایات

اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرسکیں (تقاریر محمد علی جناح جلد دوم۔ ص۴۲۳ و ۴۶۳)

یہ تھا آزادی کے مفہوم کے متعلق ہمارا اختلاف جس کی بنا پر ہم نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف محاذ قائم کیا تھا ہماری یہ محاذ آرائی اسوقت تک جاری رہی جب تک ہم نے پاکستان حاصل نہ کرلیا۔

ہم نے آزادی کے اپنے منفرد مفہوم کے لئے پاکستان حاصل کرلیا لیکن اس کے بعد دنیا نے ایک عجیب تماشہ دیکھا کہ یہاں پہنچ کر ہم نے مغرب کے اس جمہوری نظام کو رائج کرلیا جسے اقبالؒ نے اسلام کیخلاف سازش قرار دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے دو باتیں کہی تھیں۔ ایک یہ کہ مغرب کا جمہوری نظام، استبداد ملوکیت ہی کی ایک نقاب پوش شکل ہے۔ اس میں نوعِ انسان کبھی آزادی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ نظام، اسلام کی ضد ہے۔ اس لئے اس میں مسلمان کو وہ آزادی میسّر نہیں آسکتی جو اسے اسلام عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں آج کی نشست میں اقبالؒ کے ان ہر دو دعاوی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا اپنی آزاد مملکت کے حصول کے بعد، مغرب کے جمہوری نظام میں ہمیں حقیقی آزادی نصیب ہوگئی ہے؟ اور دوسرے یہ کہ اس نظام کے متعلق خود مغرب کے اربابِ فکر و دانش اب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

جمہوری نظام کے اساسی اصول

مغرب کے جمہوری نظام (ڈیماکریسی) کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں اور ان کے اس اقتدار پر کسی اور کا کنٹرول نہیں۔ عوام کو اقتدارِ مطلق حاصل ہے۔ (DEMO - CRACY) کے معنی ہی عوام کی حکومت ہیں۔

۲۔ اس نظام میں عوام اپنے حاکم آپ ہوتے ہیں اس لئے حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس میں یہ تفریق ہی مٹ جاتی ہے۔

۳۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں۔

۴۔ ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے، یعنی وہ آئین یا قوانین جنہیں وہ وضع کردیں، حرفِ آخر ہوتے ہیں جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہوسکتی۔ البتہ یہ نمائندے اپنے فیصلوں کو جب بھی چاہیں خود بدل سکتے ہیں۔

۵۔ عوام کے یہ نمائندے دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ جو گروہ اکثریت میں ہوتا ہے وہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔ جو اقلیت میں رہ جاتا ہے اس کا مسلک اکثریت کی مخالفت کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی رو سے وہ اقلیت میں تبدیل ہوجائیں اور اس طرح اقتدار ان سے چھن کر ان کے ہاتھ میں آجائے۔

۶۔ برسرِ اقتدار (اکثریتی) پارٹی جو کچھ جی میں آئے کرے۔ اُسے اس مدت سے پہلے جس کے لئے عوام نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا، خود عوام بھی برطرف نہیں کرسکتے بجز اس کے کہ وہ اکثریت میں نہ رہیں۔

مغرب کے اربابِ فکر و نظر اس نظام کے عملی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نظام ایسے مفروضوں پر مبنی ہے جن کا یا تو وجود ہی کوئی نہیں اور یا جو یکسر باطل ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان اربابِ علم و دانش کے نتائجِ فکر کو سامنے لائیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ مغرب نے اس نظام کو وضع اور اختیار کن حالات میں کیا تھا۔

اقوامِ یورپ استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی تھیں یعنی ملوکیت کی قہرمانی اور اربابِ کلیسا کی تھیاکریسی ——— تھیاکریسی کا نظریہ سینٹ پال کا وضع کردہ ہے جس نے کہا تھا کہ

یورپ کا انقلاب

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنا یہ حق کلیسا (پادریوں) کو تفویض کر دیا ہے اب یہ خدا کے نام پر جو جی میں آئے کریں۔ جب کلیسا اور رومن شہنشاہیت میں کچھ جوڑ ہوا تو یہی اختیاراتِ خداوندی شہنشاہوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ لیکن ان پر کنٹرول کلیسا ہی کا رہا۔ لوتھر نے اپنی اصلاحی تحریک سے کلیسا کے فولادی شکنجے کو یہ کہہ کر توڑ ڈالا کہ انجیل کے سمجھنے کا حق ہر فرد کو حاصل ہے نہ کہ صرف چرچ کو لیکن اس سے نظامِ حکومت کا مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون ہی نہیں دیا گیا۔ لہٰذا حکومت کا استبداد بدستور قائم رہا۔ اس صورتِ حالات سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس کا نتیجہ روسو کا نظریۂ حکومت تھا۔ اس نظریہ کی رو سے کہا یہ گیا کہ حقِ اقتدار نہ بادشاہوں کو حاصل ہے۔ نہ کلیسا کے خدائی نمائندوں کو۔ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ یوں نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آیا۔ اگرچہ اس کا اساسی تصور مفکرینِ یونان نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ ملوکیت اور کلیسا کے استبداد کی چکی میں پسنے والی انسانیت نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر نہایت جوش و خروش اور مسرت و انبساط سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اسے نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت سمجھا۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا۔ کہ نظریۂ جمہوریت (ڈیماکریسی) کے سامنے آنے پر یہ جوش و مسرت، درحقیقت استبدادِ ملوکیت اور قہرمانیٔ مذہبی پیشوائیت سے حصولِ نجات پر منفیانہ ردِ عمل تھا۔ نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا۔ اس نظام پر تو ابھی تجربہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے عملی تجربہ کے بعد مفکرینِ مغرب جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اس ضمن میں میں اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" کے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ مزید تصریحات اب پیشِ خدمت ہیں۔ مفکرینِ مغرب کے عملی تجربہ کا ملخص کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر (EWING) کے الفاظ میں یہ ہے کہ

> اگر روسو، عصرِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا (حوالہ ۱ - تمام حوالے خطاب کے آخر میں ملیں گے)

اس نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی تھی کہ اس میں لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں اور اس طرح حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے لیکن فرانسیسی مفکر رینی گوئن اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ خود اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ اس میں جو لوگ برسرِ اقتدار آ جاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔ یعنی حکومت عوام کی ہے۔ (حوالہ ۲)

شکاگو یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (ALAN GEWIRTH) حقیقت کی نقاب کشائی ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

> اس نظام میں پبلک یا قوم کے الفاظ ایک افسانہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس میں درحقیقت محض مؤثر پارٹیاں اپنا وجود رکھتی ہیں جو ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو نظریۂ جمہوریت جوشِ خطابت کا پیدا کردہ افترا ہوتا ہے جس میں صداقت، نیکی اور حسنِ عمل کے الفاظ کے حربے ہوتے ہیں جن کے ساتھ یہ گروہ میدانِ کارزار یا مارکیٹ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ (حوالہ ۳)

اس نظریہ کا دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس میں حکومت عوام کی رضامندی سے قائم ہوتی ہے اور جو حکومت کسی کی رضامندی سے قائم ہو۔ اس کی فرماں پذیری اس پر لازم آجاتی ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار گروہ کی حکمرانی استبداد نہیں ہوتا، عوام کی بطیب خاطر رضامندی پر مبنی نظام اطاعت ہوتا ہے۔ پروفیسر (GEWIRTH) اس باب میں لکھتا ہے کہ (یہ مفروضہ بھی محض افسانہ ہے) "اس نظام میں لوگ حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوتے ہیں جو اکثریت کی قائم کردہ ہوتی ہے جس اقلیت نے ان نمائندوں کے خلاف ووٹ دیئے تھے یا جنہوں نے سرے سے ووٹ ہی نہیں دیئے تھے۔ اُن کی اطاعت کو بطیبِ خاطر اطاعت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے"۔ (حوالہ ۴)

جمہوری نظام میں، مذکورہ مفروضہ کے مطابق حق اقتدار عوام کی مرضی کو حاصل ہوتا ہے اور یہ اقتدار بلا حدود و قیود ہوتا ہے۔ فرانسیسی مفکر (BERTRAND DE JOUVENEL) نے (SOVEREIGNTY) کے نام سے ایک بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے۔ وہ اس باب میں اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

> ہر اونٰی تعمق پر حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کرلیں کہ انسانی مرضی اور ارادے (HUMAN WILL) کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظام حکومت بھی قائم ہوں گے حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حق مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے (ص ۱۹۹)

اِس مفکر کی اس تحقیق کے بعد اقبال کا وہ شعر پھر سامنے لائیے جو اس نے اس سے بہت پہلے کہا تھا اور جسے میں شروع میں پیش خدمت کرچکا ہوں کہ

> ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

آپ نے دیکھا کہ جس شخص کی بصیرت شمعِ قرآنی سے کسبِ ضیا کرتی ہو۔ وہ کس قدر جلد حقائق کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ اسکی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — گفتارِ دیدہ احوالِ چمن گفت۔ اور اسی بنا پر وہ حتم و یقین کے ساتھ (لیکن بغیر کسی دعویٰ کے) کہہ سکتا ہے کہ:

> حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے — عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے۔

برٹرینڈ نے کہا تھا کہ انسانی ارادے کو مطلق اقتدار کا حق سونپنے کا نتیجہ استبداد اور مطلق العنانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا خواہ نظام کوئی سا بھی کیوں نہ ہو۔ اس سے مغربی مفکرین کے سامنے یہ اہم سوال آیا کہ اگر انسانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا تو پھر حق مطلق کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ وہ لوگ اپنی مدت العمر کے فکری تجسس کے بعد اس باب میں جس نتیجے پر پہنچے

ہیں وہ انتہائی غور و تعمق کا متقاضی ہے۔ ان ارباب فکر کا کہنا ہے کہ نظام حکومت مقصود بالذات نہیں۔ یہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور وہ بلند مقصد ہے قیام عدل۔ اس کے بعد عدل کے متعلق ان کی تصریحات اور تقاضے ملاحظہ فرمائیے۔

عدل سے مراد

مشیگن یونیورسٹی کا فلسفہ کا پروفیسر (WILLIAM K. FRANKENA) لکھتا ہے کہ:

> عدل، قوانین مملکت کے مطابق فیصلوں کو کہا جاتا ہے۔ قانون کی اصطلاح میں تو ایسا کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود مملکت کے قوانین ہی عدل پر مبنی نہ ہوں۔ تو ان کے مطابق عملی اقدامات کو آپ سوشل جسٹس کس طرح کہہ سکیں گے (حوالہ ۵)

اس سے یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ اگر مملکت کے قوانین بہرحال مبنی برحق و صداقت قرار نہیں پا سکتے تو پھر حق و باطل اور (JUST AND UNJUST) کا معیار کیا ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں یہ پروفیسر (LEWIS) کے الفاظ میں لکھتا ہے کہ:

> حق اسے کہیں گے جو تمام حالات میں حق ہو اور ہر فرد کیلئے یکساں طور پر حق ہو۔ عالمگیریت حق کی بنیادی شرط ہے۔ (حوالہ ۶)

نہ صرف عالمگیریت بلکہ ابدیت بھی۔ یعنی اسے ہر زمانے میں حق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں وہ ٹینی سن کا یہ شعر نقل کرتا ہے کہ:

> نیکی، صداقت یا پاکیزگی اور عدل ان سے ابدیت کی کشش نکال دیجئے۔ تو یہ سب راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیں گے۔

اس کے بعد وہ (EMIL BRUNNER) کا یہ قول درج کرتا ہے کہ:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے، جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماورا ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کیلئے اس قسم کا مطلق الوہیاتی معیار موجود ہے ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ کا مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی، اور یا پھر یہ جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور خالی برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوگی۔ (حوالہ ۷)

آکسفورڈ اور کیمبرج کے ایک ممتاز صاحب علم (ERNEST BARKER) نے سیاست مدن سے متعلق

ابدی اور غیر متبدل قانون

ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے۔ (PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY)

وہ اس میں لکھتا ہے کہ:

اس مقام پر ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ کیا مملکت کے آئینی قانون کے شانہ بشانہ کوئی ایسا قانون بھی موجود ہے جو حقیقی اقدار پر مبنی ہے ..... وہ قانون جسے ہم "فطری" کہہ سکیں کیونکہ وہ اشیائے کائنات کی فطرت، یا خود انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ قانون جو اس الحق پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی ذات میں حق ہوتا ہے جو اس عدل پر مبنی ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر زمانے میں عدل ہوتا ہے۔ جو ان اقدار پر مبنی ہوتا ہے جو اپنی قیمت آپ ہوتی ہیں خواہ انہیں آئینی حیثیت حاصل ہو یا نہ۔ یہ سوال آج کا پیدا شدہ نہیں۔ یہ (SOPHOCLES) اور ارسطو کے زمانے میں بھی موجود تھا۔ ارسطو نے اس قانون میں جسے کوئی قوم خود وضع کر کے اپنے لئے اختیار کر لے اور اس میں جو تمام نوع انسان کے لئے عالمگیر ہو، تفریق کرتے ہوئے کہا تھا کہ موخر الذکر قانون، قانون فطرت ہے ...... وہ قانون جو اس وقت بھی موجود ہوتا ہے جب نہ کسی قوم کا وجود ہو اور نہ کسی ایسے معاہدہ کا وجود جو مختلف افراد کو ایک رشتے میں منسلک کر دے۔ اس کی تائید میں ارسطو نے سوفوکلس کا یہ شعر درج کیا ہے کہ:

اس قانون کی قوت، امروز و فردا کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ایک دائمی چشمہ سے پھوٹتا ہے جس کے منبع کا کسی انسان کو علم نہیں۔ (صـ۹)

اس کے بعد وہ (BLACK STONE) کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ:

قانونِ فطرت کی اطاعت دنیا کی ہر اطاعت پر مقدم ہے۔ انسانوں کا وضع کردہ کوئی قانون جو اس قانونِ فطرت کے خلاف ہو، کبھی جائز قرار نہیں پا سکتا۔ (صـ۱۰)

امریکی پروفیسر (EDWARD CORWIN) نے جو کانسٹی ٹیوشن اور اس کی تاریخ پر اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، ایک نہایت مختصر لیکن بڑی پُر مغز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE HIGHER LAW) اس کی بحث و تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ آئین کی بنیاد اُن اصول و اقدار پر ہونی چاہیئے جو انسانوں کی وضع کردہ نہ ہوں اور زمان و مکان کی حدود سے ناآشنا ہوں۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "یہ نظریہ کہ مملکت کے آئین کو اس لئے بالادستی (SUPREMACY) حاصل ہے کہ اس کی جڑیں عوام کے ارادے (پاپولر ول) کی پیدا کردہ ہیں۔ امریکی آئین میں بعد کا پیدا شدہ ہے۔ ابتدا میں آئین کی فوقیت کا بنیادی معیار غیر متبدل اور لا ابدی عدل کا تصور تھا اور انسانی ارادہ کو اس میں نسبتاً بہت کم دخل تھا۔ یہ نظریہ موجودہ قانون کی ضد تھا۔ اس میں اس حیثیت کو تسلیم کیا گیا تھا کہ کائنات میں حق و صداقت اور عدل کے ایسے اصول موجود ہیں جنہیں اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی قدر و قیمت کی بنا پر باقی اصولوں پر غالب رہیں، اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ کا اس باب میں کیا طرزِ عمل ہے۔ ان اصولوں کو کسی انسانی ہاتھ نے نہیں بنایا۔ یہ اصول اگر خود خدا سے قدیم نہیں تو اتنا ضرور ہے کہ ان کی رو سے خدا کا ایسا تصور سامنے آتا ہے جو انہیں کنٹرول کرتا اور باہمدگر مربوط رکھتا ہے۔ یہ اصول موجود فی الخارج ..... اور ازلی ابدی اور غیر متبدل ہیں۔" (صـ۵-۴)

اس کے بعد کارون، مشہور مقنن (CICERO) کے یہ الفاظ نقل کرتا ہے کہ:

حقیقی قانون، مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اسکا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے۔ نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کر دے..... نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (صفحہ ۱)

اس کے بعد وہ (CICERO) کے یہ ناقابل فراموش الفاظ درج کرتا ہے کہ

سچا قانون وہ ہے جو فطرت کے عطا کردہ معیار کے مطابق حق اور باطل میں امتیاز کر دے اس کے علاوہ کوئی قانون بھی ہو اسے نہ صرف یہ کہ قانون سمجھنا نہیں چاہیئے۔ اسے قانون کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ (صفحہ ۱۲)

نہ صرف یہ کہ ایسے قانون کو قانون سمجھنا اور کہنا نہیں چاہیئے۔ (BARKER) کہتا ہے کہ ایسے قانون کی اطاعت ہی نہیں کرنی چاہیئے۔ اسکے الفاظ یہ ہیں:

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (LOYALTY) ان اقدار کے تابع ہے جن کے (تحفظ کے) لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر یہ مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو ان اقدار کے تقاضے کی رُو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اس طرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے بادل ناخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کروں۔ (صفحہ ۱۶۵)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رو سے ہم پر اسکی اطاعت بہر حال واجب ہو۔ اسکے بجائے امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پر مملکت کے ارباب اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے (صفحہ ۱۹۳)

آگے چل کر وہ کہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب، مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اسوقت تک واجب ہوتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضا کے ساتھ ٹکرائے نہیں۔ (صفحہ ۲۲۰)

آپ نے غور فرمایا، عزیزان من! کہ نظام جمہوریت کے تلخ نتائج کا ستایا ہوا انسان اب کس قسم کے قانون کی تلاش میں ہے۔ ایک ازلی، ابدی، عالمگیر قانون جس کا سرچشمہ انسانی فکر سے بلند اور ماورا ہو!

اس کے بعد مغرب کا یہ مفکر بصد حرمان و یاس، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتا ہے کہ جمہوری نظام کے ہاتھوں تنگ آتے ہوئے متلاشیانِ حقیقت کی مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے قوانینِ فطرت کا ضابطہ کہیں موجود نہ تھا۔

(BARKER . P. 100)

مفکرینِ مغرب کی دشواری

انسانوں کے خود ساختہ قوانین و ضوابط کا ستایا ہوا انسان آج بھی اپنے آپ کو اسی مقام پر پاتا ہے جہاں اس زمانے کا انسان تھا جس نے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد سے نجات کی راہ نظامِ جمہوریت میں سمجھی تھی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ جسے چشمۂ حیات سمجھ کر اس کی طرف لپکا تھا وہ سراب ثابت ہوا۔ اور چشمۂ حیات کا اب بھی اسے کوئی سراغ نہیں مل رہا اگرچہ اس کی تلاش میں وہ اسقدر سرگرداں و حیراں اور مضطرب و بیتاب ہے۔ ان کی فکر نے انہیں اتنا تو بتا دیا ہے کہ وہ ضابطہ قوانین جس میں انسانیت کی نجات کا راز مضمر ہے، کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ وہ ازلی ابدی، زمان و مکان سے ماوراء عالمگیر ہونا چاہیئے۔ وہ اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہیں کہ ایسا قانون انسانوں کا خود ساختہ نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر ایسا ضابطۂ قوانین وضع ہی نہیں کر سکتی۔ اس کا سرچشمہ انسانی فکر سے ماوراء ہونا چاہیئے۔ وہ یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں لیکن وہ اسے منزل من اللہ یا وحی کہہ کر نہیں پکارتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے اسے قانونِ خداوندی کہہ دیا تو پادری یہ کہتے ہوئے بھاگے بھاگے آجائیں گے کہ جس قانونِ خداوندی کے تم متلاشی ہو وہ قانون ہم دے سکتے ہیں کیونکہ ہم خدا کے نمائندے ہیں۔ اس سے ان پر پھر کلیسا کا وہی استبداد پھر مسلط ہو جائے گا جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے نظامِ جمہوریت وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس ڈر سے وہ اپنے مطلوبہ ضابطۂ قوانین کو قانونِ فطرت یا فطرتِ انسانی میں مضمر قانون جیسی مبہم اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی دوسری مصیبت یہ ہے کہ انہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ قانون ملے گا کہاں سے؟ فکرِ مغرب کی یہی بے کلی اور بیتابی اور دوسری طرف بے بسی اور بے چارگی تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ:

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار ❊ عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ❊ زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مسلمانوں کی حالت

مغربی اقوام کی بے بسی کا تو یہ عالم ہے لیکن مسلمان کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں ہی کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اس لئے بدترین لعنت ہوتی ہے کہ اس میں اقبال کے الفاظ میں ـــــ "جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر" ہوتے ہیں محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو ـــــ (حاکم قوم) کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اسکی آنکھ سے، سنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے۔ وہ قومِ غالب کے ہر نظریہ، مسلک یا نظام کو عرشِ معلی سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجب ہزار فخر و مباہات قرار دیتا ہے۔ اقوامِ غالب اپنی پھینکی ہوئی ہڈیوں کو اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں لپک کر اٹھاتا اور اپنے لئے خوانِ نعمت

سمجھتا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمال فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اس وقت یہ نظام خود اقوامِ مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہمارے ہاں شروع میں تو اس نظام کی حیثیت سیاسی سی تھی لیکن جب یہاں اُس جماعت نے جو اقامتِ دین کی مدعی ہے، اپنے مصالح کے پیشِ نظر۔۔۔ بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلائی تو اس نظام کو عین اسلامی قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ نظام، یکسر اسلام کی ضد ہے۔

قرآنی نظام

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل و اساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے۔ اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین و قانون سازی کا حقِ مطلق حاصل ہوتا ہے۔ قرآن سرے سے اس مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے۔۔۔ خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (۱۲/۴۰) قرآن کریم کے اس اوّلین اصول کی رو سے ایک طرف مغربی نظامِ جمہوریت خلافِ اسلام قرار پاجاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے۔ اس کی رو سے انسانوں کی حکومت خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہرحال غلامی ہے۔ اس سے علامہ اقبال کے اس جواب کی حقانیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے جو انہوں نے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا جائے اور اسکی جگہ اہلِ ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے تو ہندو کے نزدیک بیشک یہ آزادی قرار پاجائیگی۔ لیکن مسلمان کے نزدیک، جو قرآن کا متبع ہے، یہ بدستور غلامی کی غلامی رہے گی اور ایک باطل نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے باطل نظام کا قیام۔

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اسلئے کہ قرآن کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظامِ حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انسانوں کی تمدنی زندگی کے لئے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا (۱۸/۲۶) بنا بریں۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۳۰/۳۰) یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (FORM) بدل کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ سامنے آجاتا ہے جس سے مجبور ہو کر اہلِ مغرب نے نظامِ جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہاں مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا۔ کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے، لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے نمائندے ہیں، اس

لئے ہماری حکومت انسانوں کی حکومت نہیں۔ خدا کی حکومت ہے۔ اس سے تھیاکریسی کا وہ نظام حکومت وجود میں آگیا جو ملوکیت سے بھی بدتر تھا۔ ملوکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جا سکتی تھی جس کی نوعیت بہرحال سیاسی سمجھی جاتی تھی۔ خدا کے ان (مزعوم) نمائندوں کے خلاف بغاوت، خود خدا کے خلاف بغاوت قرار پاجاتی تھی۔

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل نہیں ہوگا کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا کرتا۔ یہ اس کی کتاب کے اندر محفوظ ہیں۔

اسکا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خود زبان نبوی سے کہلوایا گیا کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ (۶/۱۱۴) "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب و جستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصل ہے"۔ یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تھیاکریسی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جو ضابطہ زندگی بن سکتی۔ (انجیل میں قوانین ہیں ہی نہیں) اسلئے جب خدا کی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے عجد لوگوں کو لازماً مذہبی پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذات رسالتمآبؐ سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اولین حق بہرحال رسول اللہ کو پہنچتا تھا۔ جب حضورؐ نے بھی یہ فرما دیا کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی رُو سے حکومت، خدا کی کتاب کے احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی قرار پاگئی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار، کفر سورت مائدہ میں ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسول اللہ سے فرما دیا گیا کہ۔ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۹) "ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو"۔ گویا یہاں پھر اسے دہرا دیا کہ یہ حکومت تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآن کریم نے خدا کے سوا ہر اقتدار کو طاغوت کہہ کر پکارا ہے۔ اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۔۔۔۔ (۲/۲۵۶) "جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے انکار کیا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا" اور اس "کفر بالطاغوت" کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ "کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ اور کتب سابقہ پر ایمان لے آئے ہیں لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (۴/۶۰) "اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے انکار کریں"۔ یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لئے اس کی کتاب کو اقتدار کی تسلیم کیا

جائے۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور اتھارٹی تسلیم کرلی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اسے مفصّل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۶/۱۱۵) خدا کے کلمات (قوانین خداوندی) صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ ضابطہ خداوندی مفصّل، مکمّل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کیلئے محفوظ بھی۔ (۱۵/۹)

لیجئے! جس قسم کے ضابطۂ حیات کی مفکرین مغرب کو تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں سے ملتا نہیں تھا، وہ سامنے آگیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مفکرین مغرب اپنے عقلی و تجرباتی طریق سے اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ اس قسم کا ضابطہ اور نظام، انسانی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے لیکن انہیں اس کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ ضابطہ ملے گا کہاں سے؟ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی حقیقی شکل میں آجائے تو وہ یقیناً اسے لپک کر اٹھالیں۔ اس کے راستے میں رکاوٹ کیا ہے اسے میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب کے تابع زندگی بسر کرنا آزادی ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کس کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت خدا کی کتاب کی نہیں تو یہ آزادی نہیں، محکومی ہے، خواہ اس مملکت میں اقتدار خود اپنی قوم اور عوام کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ انسانوں کو آزادی صرف کتاب اللہ کی رو سے مل سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۔ اہل کتاب ہوں یا مشرکین، کسے باشد، انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ ان کے پاس واضح حقیقت نہ آجاتی ـــــ یعنی اللہ کا رسول نہایت پاکیزہ صحائف لیکر ـــــ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔ (۹۸/۳) وہ صحیفہ آسمانی جس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔ نوع انسان کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی ہے تھی اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیریں ٹوٹ سکتی تھیں جن میں نوع انسان جکڑی چلی آرہی تھی اور اسی سے وہ بوجھل سلیں ان کے سر سے اتر سکتی تھیں۔ جن کے بوجھ تلے وہ اس بری طرح دبی ہوئی تھی۔ (۷/۱۵۷)

استخلاف فی الارض

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے بالفاظ دیگر اسے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانین خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اسکی حیثیت صرف اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے۔ یہیں سے لفظ خلیفہ ہے۔ (ضمناً) یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے۔ جس کی رو سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے اپنے اختیارات اپنے نمائندی (کلیسا) کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت

پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ اسی تصور سے متاثر تھا وہ ذہن جس نے ایک دفعہ حضرت صدیق اکبرؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے اسے سختی سے روک دیا اور کہہ دیا کہ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں خلیفۃ الرسولؐ (یعنی رسول کا جانشین) ہوں۔ اور حضرت عمرؓ نے اتنے سے التباس کے امکان کو بھی ختم کرنے کے لئے خلیفہ کے بجائے امیر المومنین کا لقب اختیار فرمایا۔

اس مقام پر ذرا رک جائیے اور دیکھئے کہ الفاظ جب تاریخ کی مختلف وادیوں سے گزرتے ہیں تو ان کے حقیقی معانی کس طرح ان راہوں کے گرد و غبار میں چھپ جاتے ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے وہ کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ امیر کے بنیادی معنی راستے کی نشاندہی کرنے والے یا راہنما کے تھے اور آج جن معانی میں یہ لفظ ہمارے ہاں مستعمل ہے وہ کیا ہے؟ یہ وجہ ہے کہ جو میں اس پہ زور دیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم کو اس کے مفردات کے اولین معانی کی رو سے سمجھنا چاہیئے نہ کہ ان معانی کی رو سے جن کا لبادہ ان الفاظ نے بعد میں اوڑھ لیا۔

بہر حال بات "استخلاف فی الارض" کی ہو رہی تھی جس سے مراد ہے وہ قوت جس کی رو سے قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جائے۔ زمانہ قدیم میں، جب ہنوز قوت کا مرکز شخصیتیں ہوتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلیفہ کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ ص میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے۔ یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸/۲۶) "اے داؤدؑ، ہم نے تمہیں ملک میں خلیفہ بنایا ہے سو تم لوگوں میں الحق (وحی خداوندی) کے مطابق حکومت قائم کرو"۔ لیکن جب نوعِ انسان اپنے بچپن کی منزل طے کر لینے کے بعد عالمِ شباب تک آ پہنچی تو شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا اور عالمگیر انسانیت کے لئے "وحی کی راہنمائی میں اپنے معاملات آپ طے کرنے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ تاریخ میں حضور رسالتمآبؐ اس دورِ کہن کے اختتام اور عصرِ جدید کے آغاز کے نقطۂ اتصال پر فائز نظر آتے ہیں۔ ختمِ نبوت کا اعلان اسی انقلاب کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر استخلاف فی الارض، اشخاص کے بجائے امتوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے متعلق تو فرمایا کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ۔ لیکن حضور خاتم الانبیاءؐ کے زمانے میں کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ (۲۴/۵۵) "تم میں سے جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے اتریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا"۔ یہ خدا کا وعدہ، یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔ یعنی اب استخلاف فی الارض اشخاص کے بجائے امتوںؑ کے حصے میں آئے گا۔ سوچئے عزیزانِ من! کہ اس انقلابِ عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اس زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور افراد کی جگہ امتوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ روسو کا فلسفہ اور انقلابِ فرانس تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآن کریم کے تجویز کردہ نظام کی رو سے استخلاف فی الارض، امتِ مسلمہ (یعنی امتِ محمدیہ) کے حصے میں آیا۔ اس امت سے کہہ دیا گیا کہ ان احکام و قوانین کی کارفرمائی کے لئے جو عملی پروگرام تجویز اور اختیار کیا جائے گا۔ وہ بھی کسی ایک فرد کا طے کردہ نہیں ہو گا۔ وہ تمہارے باہمی مشورے سے طے ہو گا ——— وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) حتیٰ کہ اس نظام کے سربراہِ اوّل، جو بہر حال رسول اللہ ہی ہو سکتے تھے، اسے بھی تاکید کر دی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) "مملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افرادِ امت سے مشورہ کیا کرو"۔ ان احکامات کی رو سے، قرآن کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت ——— ملوکیت یا آمریت ——— کا خاتمہ کر دیا۔

ؑ اقوامِ سابقہ کے استخلاف میں "ملوک" ہوتے تھے جنہیں قرآن نے ختم کر دیا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض یعنی نظامِ حکومت "مقصود بالذات نہیں تھا" ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اور وہ بلند مقصد تھا، قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ و اجراء۔ سورۃ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں تمہیں استخلاف فی الارض، حاصل ہوگا" اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کردی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ ۔ (۲۴/۵۵) تاکہ اس سے اس دین کا تمکن ہو جائے (وہ نظامِ زندگی قائم اور (ESTABLISH) ہو جائے) جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ مملکت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سندِ قبولیت حاصل ہو" اور ان سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ سورۃ حج میں ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہوگا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ان کے تمکن کا مقصد۔ اس میں تمام معاملات انجام کار خدائی پروگرام کی تکمیل کے لئے سرانجام پائیں گے۔

پھر دُہرا دیا جائے کہ چونکہ یہ تمکن فی الارض" پوری کی پوری امت کو حاصل ہوگا نہ کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو اس لئے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا فریضہ بھی پوری کی پوری امت کا ہوگا نہ کہ کسی ایک گروہ کا۔ سورۃ آلِ عمران میں ہے كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳/۱۰۹) (واضح رہے کہ (۳/۱۰۳) میں جو کہا گیا ہے کہ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ ... تو اس سے بھی مراد ساری کی ساری امت ہے" نہ کہ امت کا کوئی ایک گروہ۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) (۳/۱۱۲ - ۳/۱۰۹) "تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے"۔ یہی اس امت سے کہا گیا اور یہی اس نظام کے سربراہ اوّل حضور نبی اکرمؐ سے (۷/۱۵۷ ، ۹/۷۱)

متعدد مقامات پر اس کی بھی وضاحت کردی کہ اس نظام میں (امت یا خود رسول اللہؐ) کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات (قرآن کریم) میں کسی قسم کا ردّ و بدل کر سکیں۔ مخالفین کہتے کہ ہم اس نظام میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں، بشرطیکہ تم اس ضابطہ میں کچھ تبدیلیاں کردو۔ اس کے جواب میں حضورؐ فرماتے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ۔ یہ میرے حیطۂ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کردوں۔ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۔ میں تو خود بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں۔ جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۔ (۱۰/۱۵) " اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اس کی سزا سے میں بھی نہیں بچ سکتا" نیز (۶/۱۱ ، ۶/۵۰ ، ۴۶/۹)

یہاں سے ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں خود اسی ضابطۂ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے محفوظ نہیں

رہ سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ اطاعت اس ضابطۂ خداوندی (قرآن کریم) کی ہے۔ اسلامی نظام مملکت اس کی اطاعت کرانے کی مشینری وضع کرتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں "خدا اور رسول کی اطاعت" کا حکم ہے تو اس کا عملی مفہوم اس نظام کی اطاعت ہے جو اس ضابطۂ خداوندی کو عملاً نافذ کرتا ہے۔ سورہ النور میں ہے۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ (۲۴/۵۱) "مومنوں کی روش یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں خدا اور اس کے رسول کیطرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ رسول ان کے معاملات کا فیصلہ کرے تو وہ بطیب خاطر کہتے ہیں کہ ہم نے اس حکم کو سن لیا ہے اور ہم اس کی اطاعت کریں گے"۔ اس سے دو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

۱۔ معاملات کے تصفیہ کے لئے بلایا جاتا ہے "خدا اور رسول" کی طرف۔

۲۔ ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ رسول ان کے معاملات کا فیصلہ کرے۔

۳۔ رسول سے کہا جاتا ہے۔ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ (۵/۴۹) ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرو۔

۴۔ مومنین ان فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔

اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ اطاعت درحقیقت کتاب اللہ ہی کی ہے۔ نظام مملکت اسلامیہ اس کی اطاعت کرانے کا عملی ذریعہ ہے اس نظام میں اپنی اطاعت کوئی بھی نہیں کرا سکتا ــــ نہ کوئی ایک فرد، نہ افراد کا مجموعہ۔ سورہ آل عمران میں ایسی

اطاعت صرف کتاب اللہ کی ہے

حقیقت کو واضح ترالفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ!

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا ــــ خواہ خدا سے ضابطۂ قوانین یا حکومت یا نبوت ہی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں، میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت کے ذریعے، جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو۔ اللہ کے محکوم (ربانی) بن جاؤ۔

رسول اللہ لوگوں سے جو بیعت (حلف وفاداری مملکت) لیتے تھے، وہ بھی درحقیقت اطاعت خداوندی ہی کے اقرار

حلف وفاداری

واعلان کی بیعت ہوتی تھی۔ اسی لئے قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ "جو لوگ اے رسول! تیری بیعت کرتے ہیں یہ درحقیقت خدا کی بیعت ہے" يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (۴۸/۱۰) "ان کے ہاتھ پر مجازی طور پر تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن معنوی طور پر وہ خدا ہی کا ہاتھ ہوتا ہے"۔ اور اس بیعت میں اس امر کی صراحت ہوتی تھی کہ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ۔ (۶۰/۱۲)۔ یہ اطاعت معروف میں ہوگی منکر میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ

کبھی منکر کا حکم نہیں دے سکتے تھے جو یہ کہلانے کی ضرورت پڑتی کہ ہم صرف معروف میں آپ کی اطاعت کریں گے اس کی وضاحت اس لئے کر دی گئی کہ اس نظام کو حضورؐ کے بعد بھی آگے چلنا تھا۔ ان آنے والوں کے لئے اس کی وضاحت کر دی کہ اس نظام کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک یہ معروف کا حکم دے (یعنی قرآنی اصول واقدار کے مطابق) اگر اس کا کوئی حکم منکر کا ہو (یعنی کسی ایسی بات کا جسے قرآن ممنوع اور ناپسندیدہ قرار دیتا ہے) تو امرت کی گردن سے اس کی اطاعت کا جُوا اتر جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدینؓ اپنے ادکین خطبۂ خلافت میں اعلان کر دیا کرتے تھے کہ:

تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو۔ تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ (خطبہ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ)

اور ان حضرات کے یہ اعلانات درحقیقت ان ارشادات قرآنیہ ہی کی توضیح و تشریح تھے جن میں کہا گیا ہے کہ

کسی کی اطاعت نہیں کی جائیگی

احکامِ خداوندی کے خلاف کسی کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً اس نے کہا ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

(۱۸/۲۸)

جو ہمارے قوانین کی طرف سے غافل ہو جائے اور اپنے جذبات ہی کے پیچھے لگ جائے اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے گذر جائے۔ اسکی اطاعت مت کرو۔

دیگر مقامات میں ہے کہ کسی جابر و مستبد (۲۶/۱۵۱) مفسد اور مسرف (۲۶/۱۵۲) کی اطاعت مت کرو کیونکہ اس سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قوانین خداوندی کو جھٹلانے والوں کی اطاعت مت کرو۔ (۶۸/۸) نہ ہی کسی ایسے شخص کی اطاعت کرو جو وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ہو اور یونہی قسمیں کھا کھا کر لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا چاہے۔ مختلف حربوں اور وسوسہ انگیزیوں سے جماعت میں تفرقہ پیدا کرے۔ ہر وقت لگائی بجھائی میں مصروف رہے اور اپنی باتوں میں جھوٹ سچ ملا کر فساد برپا کرنے کی کوششوں میں مشغول خود بھی کوئی بھلا کام نہ کرے اور دوسروں کو بھی بھلائی کے کاموں سے روکتا رہے۔ صحیح قوانین سے سرکشی برتنے میں سب سے آگے اور منفعت بخش امور میں سب سے پیچھے ہو۔ شقی القلب، سخت گیر، بے رحم، جھگڑالو۔ ہر وقت کوشش یہ کہ دوسروں کا سب کچھ سمیٹ کر ہڑپ کر جائے۔ اس قسم کے لوگ اس قدر ذلیل فطرت اور گھناؤنے کردار کے باوجود لوگوں کے لیڈر اس لئے بن جاتے ہیں کہ وہ مالدار ہوتے ہیں اور ان کا جتھہ (پارٹی) بہت بڑا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی اطاعت ہرگز نہ کرو (۶۸/۱۰) نہ ہی کسی آثم اور کفور کی (۷۶/۲۴) سورہ العلق میں اسی قسم کے اور عیوب دائم کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا کہ جس شخص میں یہ عیوب پائے جائیں وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے (۹۶/۱۹)

اکثریت بہرحال حق پر نہیں ہوتی

اور سب سے آخر یہ کہ غلط بات پر اگر ساری دنیا کا اتفاق بھی ہو جائے تو بھی اسے اختیار نہ کرو۔ کیونکہ حق و باطل کا معیار کتاب خداوندی ہے نہ

کہ اکثریت کے فیصلے۔ وَ اِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ ھُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۶)

لوگوں کی عام طور پر حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ظن و قیاس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی کوئی بات محض اس لئے صحیح قرار نہیں پا سکتی کہ اس کے حق میں اکثریت کی رائے ہے۔ کثرتِ رائے خواہ وہ اپنوں کی ہو یا دوسروں کی محض اکثریت کی سند سے حق نہیں قرار پا سکتی۔ (۴۹/۷)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ اس سے کس طرح مغربی نظریہ جمہوریت کی وہ بنیاد اکھڑ جاتی ہے جس پر اس نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے نظامِ حکومت کی اطاعت بھی اُس وقت تک ہے جب تک وہ نظام ضابطۂ خداوندی کے مطابق احکام صادر کرے۔ اس لئے کہ وہ نظام تو قائم ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ احکامِ خداوندی نافذ کرے گا۔ اگر وہ خود ہی ان احکام کی خلاف ورزی کرنے لگ جائے تو اسکے وجود (یا باقی رہنے) کی وجہ جواز ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی حکومت کی جگہ دوسری حکومت آجانی چاہیئے جو ضابطہ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قرآن کریم کی رو سے صحیح نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت جرمِ عظیم ہے اور اس کی سزا بڑی سخت۔ (۵/۳۳) لیکن اس کی رو سے وہی بغاوت جرم ہے جو بغیر الحق ہو۔ (۴۲/۴۲ و ۵/۳۳) حق کے خلاف جانے والی حکومت سے تو تعاون تک بھی جائز نہیں۔ (۵/۲)

لیکن یہ مقام بڑا نازک ہے اور گہرے فکر کا محتاج۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ حق ہر فرد معاشرہ یا افراد کے کسی گروہ کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کی جس بات کو اپنی دانست میں غلط سمجھے اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو اور حکومت کا تختہ الٹنے کے درپے ہو جائے۔ اسلامی حکومت اُمت کے مشورہ سے قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا اس بات کا فیصلہ بھی امت کے مشورہ ہی سے ہو گا کہ کسی قائم شدہ حکومت کو برقرار رکھا جائے یا اسے بدل دیا جائے۔ اس نکتہ کے متعلق مزید گفتگو آگے چل کر کی جائے گی۔

ہمارے ہاں عزیز! آپ نے پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ نظامِ جمہوریت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اب یہ دیکھ لیا کہ قرآنی نظام کی عمارت کن اصولوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرما لیجئے کہ کیا مغرب کے

پاکستان اور جمہوریت

جمہوری نظام کو کسی صورت میں بھی اسلامی کہا جا سکتا ہے؟ اسے اسلامی کہنا تو ایک طرف وہ اسلام کی نقیض ہے۔ اس کی ضد ہے۔ اس میں کہیں خدا نہیں آتا۔ وحی نہیں آتی۔ وحی پر مبنی مستقل اصول نہیں آتے، غیر متبدل اقدار نہیں آتیں۔ وہ دھریت پر مبنی سیکولر نظام ہوتا ہے۔ اسے اسلام سے کیا واسطہ؟

کہا یہ جائے گا کہ ہم نے اپنے ہاں اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہو گا۔ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہو گا۔ مملکت اپنا کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ ہمارے ہاں کی جمہوریت ان شرائط سے مشروط ہے اسلئے یہ اسلامی ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا نظام جمہوری ہو گا تو اس سے درحقیقت یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں ملوکیت یا آمریت کا نظام نہیں ہو گا۔

ہم جمہوریت کے لفظ کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

اس جواب کا جائزہ دو پہلوؤں سے لینا ہوگا۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جب کوئی لفظ اصطلاح کی شکل میں مستعمل ہونے لگ جائے تو وہ اپنا لغوی مفہوم کھو دیتا ہے۔ اس کے بعد آپ جب بھی اس لفظ کا استعمال کریں گے وہ اپنے ان تمام مضمرات اور لزومات کو ساتھ لائے گا۔ جن سے وہ نظریہ یا نظام عبارت ہے جس کے لئے وہ اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ ہم اہل مغرب کی مروجہ اصطلاحات کو اپنے ہاں رائج کر لیتے ہیں اور جب ان مضمرات کو سامنے لا کر کہا جاتا ہے کہ یہ خلاف اسلام ہیں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہم صرف اس اصطلاح کو لے رہے ہیں، اس کے مضمرات کو نہیں لیتے۔ ہمارے ہاں اس کے مضمرات، اسلام کے مطابق ہوں گے۔ یہ جواب یا تو جہالت پر مبنی ہوتا ہے اور یا منافقت پر۔ آپ کسی اصطلاح کو اس کے مضمرات سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ آپ اس حقیقت کو خود اپنے ہاں کی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھئے۔ ہمارے ہاں (دین میں) وحی۔ نبوت۔ رسالت (وغیرہ) اصطلاحات خاص مضمرات کی حامل ہیں اگرچہ قرآن نے ان مادوں کے مشتقات کو بعض مقامات پر ان کے لغوی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے)۔ اگر کوئی شخص اپنے لئے وحی، نبوت، رسالت، کے الفاظ استعمال کرے اور اعتراض کرنے پر کہہ دے کہ میں انہیں ان کے لغوی معنوں میں استعمال کرتا ہوں تو اسکا یہ جواب قابل پذیرائی نہیں سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ یہ الفاظ دین کی اصطلاحات بن چکے ہیں جن سے ان کے مضمرات الگ نہیں کئے جا سکتے۔ ختم نبوت کے بعد، مسلمانوں میں ان الفاظ کا استعمال کسی کے لئے بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ ان اصطلاحات کا استعمال تو ایک طرف، ہمیں اس سے بھی زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔ رسول کے لغوی معنی "پیغام بر" کے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں "پیغام بر" (الگ الگ) لکھا جائے گا تو اس کے معنی عام قاصد یا پیغام رساں کے ہوں گے لیکن جب اسے اکٹھا (پیغمبر) لکھا جائیگا تو یہ اصطلاحی رسول کا مفہوم ادا کرے گا۔ یہی صورت "پیام بر" اور "پیمبر" کی ہے۔ یہ ہے پوزیشن اصطلاحات کی۔ جمہوریت کے علاوہ آپ نے سوشلزم کی اصطلاح اپنے ہاں رائج کی۔ جب اس کے مضمرات کے پیش نظر اعتراض ہوا کہ وہ خلاف اسلام ہیں تو آپ نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم ۔۔ ان مضمرات سے انکار کرتے ہیں۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے آپ نے اس کے ساتھ "اسلامی" کا لیبل چپکا کر اسے "مسلمان" کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ کوشش سعی لاحاصل سے زیادہ نہیں۔ آپ "اسلامی سوشلزم" کہیئے یا "سوشلزم" ذہن میں غیر شعوری طور پر وہی مضمرات آئیں گے جن کے لئے سوشلزم کی یہ اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ یہی صورت جمہوریت کی اصطلاح کی ہے۔ اسے آپ لاکھ "مسلمان" کیجئے یہ "کافر کی کافر" ہی رہے گی۔ اس کا بھی مظاہرہ حال ہی میں ہو چکا ہے۔

عملی مثال

ہم نے اپنے آئین میں وہ تمام شقیں رکھ لیں جن کی موجودگی میں آپ کا دعویٰ ہے کہ ہماری جمہوریت مغربی جمہوریت نہیں رہی۔ آپ نے کہا یہ کہ ہماری جمہوریت کتاب و سنت کے تابع اور حدود اللہ کے اندر محدود ہے۔ لیکن جب مجلس قانون ساز میں اس نکتہ پر بحث ہوئی تو آپ نے دیکھا کہ آپ کے سامنے کونسی جمہوریت آئی؟ سوال زیر بحث یہ تھا کہ جب کوئی مسودہ قانون پارلیمان کے زیر غور آئیگا۔

تو اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اور حدود اللہ کے اندر مقید ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ تجویز کیا گیا کہ اس کا فیصلہ اسلامی مشاورتی کونسل کرے گی۔ لیکن جب یہ دیکھا گیا کہ آئین میں اس کونسل کی حیثیت محض مشاورتی رکھی گئی ہے تو اس مقصد کے لئے کسی اور اتھارٹی کی تلاش ہوئی۔ تجویز کیا گیا کہ اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کو اتھارٹی قرار دیدیا جائے۔ ان تجاویز کے جواب میں صدر مملکت نے فرمایا کہ ان میں سے کوئی تجویز بھی اختیار کی جائے، اس سے پارلیمان کی (SUPREMACY) باقی نہیں رہتی اور یہ چیز اصول جمہوریت کے خلاف ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آئین کو اتنی شرائط سے مشروط کرنے کے باوجود جمہوریت اسلامی نہیں بن سکی۔ اس کا تصور مغربی ہی رہا جسکی رو سے (SUPREMACY) پارلیمان کے اراکین کی اکثریت کو حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ کسی خاص ذہن کا تصور نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (جیسے کہا جا چکا ہے) کسی اصطلاح کو اس کے مضمرات سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ (DEMOCRACY) میں (CRACY) حکومت، (DEMO) یعنی عوام کی ہوتی ہے۔ جس طرح (AUTO - CRACY) میں (CRACY) (AUTO) یعنی ایک شخص کی ہوتی ہے۔ اسلام میں (CRACY) نہ ایک شخص کی ہو سکتی ہے نہ عوام کی۔ اس لئے اسلامی نظام نہ ڈیموکریسی ہو سکتا ہے نہ آٹوکریسی۔ اس میں (CRACY) کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور یہ وہ نظریہ ہے جو دنیا میں کہیں اور موجود نہیں۔ اور تو اور تھیاکریسی کی اصطلاح بھی اس مفہوم کی حامل نہیں۔ اس لئے وہ بھی خلاف اسلام ہے۔ اسلامی تصور حکومت اور نظام مملکت بالکل منفرد ہے۔ اس لئے اس کے لئے اصطلاح بھی اپنی اور منفرد ہونی چاہیئے۔ مفہوم کے اعتبار سے میں اسے (QURANO - CRACY) کہوں گا۔ اصطلاح کی اہمیت کے متعلق میں ایک اور مثال پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ جمہور یا جمہوریت کا لفظ تو قرآن میں نہیں آیا لیکن اس نے اسلامی حکومت قائم کرنے والوں کو اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (۹/۱۱۲) کہا ہے۔ آمِرُوْنَ۔ آمِر کی جمع ہے۔ اس لفظ کی جہت سے جماعت مومنین کے قائم کردہ نظام کو آمریت کہا جا سکتا ہے لیکن آپ اس لفظ کا اختیار کرنا تو ایک طرف اسے سننا بھی پسند نہیں کریں گے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ آمریت (ڈکٹیٹرشپ) عصر حاضر کی ایک خاص اصطلاح ہے جو اپنے مضمرات کے اعتبار سے اسلام کے خلاف ہے۔ آپ سوچیئے کہ کیا یہ چیز تعجب انگیز نہیں کہ ہم آمریت کی اصطلاح کو تو اس قدر مذموم تصور کرتے ہیں (حالانکہ قرآن نے مومنوں کو آمرین کہا ہے) اور جمہوریت کی اصطلاح کو چوم کر گلے سے لگاتے ہیں حالانکہ یہ بھی اسی طرح خلاف اسلام ہے جس طرح آمریت۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جائے گی کہ ہم نہ آمریت کو اس لئے مذموم سمجھتے ہیں کہ یہ اسلام کے خلاف ہے نہ جمہوریت کو اس لئے محبوب کہ یہ اسلام کے مطابق ہے۔ ہم آمریت کو اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ یورپ نے اسے مردود قرار دیا ہے اور جمہوریت کو اس لئے پسند کہ یورپ نے اسے محبوب قرار دیا ہے۔ (غلامی سے متاثر محکوم ذہنیت میں ہوتا ہی یہ ہے)۔ اس کے بعد ہم آمریت کے خلاف دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں اور جمہوریت کے حق میں براہین کے طومار۔ اقبال نے جب اتنا عرصہ پہلے کہہ دیا تھا کہ جمہوریت کے ساز کہن میں وہی نوائے قیصری ہے اور جلال پادشاہی اور جمہوری تماشہ دونوں کا نتیجہ چنگیزیت، تو یہ اس لئے کہ اس کی

فکر اقبال غلامانہ نہیں تھی

فکر غلامانہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے متعلق کہا تھا کہ:

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم!

مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ فکرِ اقبالؒ میں بھی بعض مقامات پر اسقام ہو سکتے ہیں لیکن یہ اس کی فکر کی اجتہادی غلطیاں ہیں (ان کا دعویٰ بہرحال ایک مفکر کا تھا، "مامور من اللہ" کا نہیں تھا) بایں ہمہ انہوں نے اسلام اور اس کے نظام کے متعلق جو کچھ اصولی طور پر کہا ہے وہ حقائقِ قرآن پر مبنی ہے۔ اور ان حقائق میں ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ۔

> اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستورالعمل جو غیر اسلام ہو، نامقبول و مردود ہے۔

یہ بات انہوں نے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے اس بیان کے جواب میں کہی تھی جس میں انہوں نے (مولانا مرحوم نے) وطنیت اور جمہوریت کو مطابقِ اسلام قرار دینے کی کوشش کی تھی۔ مسلمانوں کی یہی وہ غلامانہ ذہنیت تھی، جس کے احساس سے انہوں نے بحضورِ رسالتمآبؐ بصد کرب و سوز فریاد کی تھی کہ:

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر میری دانش ہے افرنگی، میرا ایماں ہے زناری

ہمارے جدت پسند طبقہ کی یہی دانشِ افرنگی اور مذہب پرست طبقہ کا زناری ایمان ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک آزاد مملکت کے وارث ہونے کے باوجود غلاموں کے بھی غلام ہوتے جا رہے ہیں۔ یاد رکھیے۔ ایمانِ خالص جو نتائج اپنے اندر رکھتا ہے، ان کا تو کہنا ہی کیا، کفرِ خالص بھی اپنے اندر کچھ نتائج رکھتا ہے۔ لیکن جب، کفر اور اسلام میں پیوند سازی شروع کر دی جائے تو اس سے نہ اسلام کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں نہ کفر کے۔ اس سے قوموں کے اعمال

پیوند سازی

غارت ہو جاتے ہیں اور مساعی نامشکور۔ ہم نے اپنے ہر آئین میں اس کا اعلان کیا کہ مملکتِ پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہوگی لیکن عملاً یہاں ایک دن بھی خدا کی حاکمیت دیکھنے میں نہ آئی۔ عملاً یہاں نظام وہی مغربی جمہوریت کا رائج رہا اور ہماری ساری بحثیں اس قسم کے مسائل پر مرکوز رہیں کہ یہ نظام برطانیہ کے انداز کا پارلیمانی ہو یا امریکہ کے طرز کا صدارتی۔ ان مباحث میں مغرب زدہ "مسٹر" بھی شامل ہیں اور اسلام کے علمبردار حضرات بھی برابر کے شریک۔ اسلام کے ان مزعومہ علمبرداروں میں جماعتِ اسلامی کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اس جماعت کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، دھڑلے سے اعلان کیا کرتے تھے کہ پاکستان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اختلاط سے جو جمہوری نظام قائم ہوگا وہ درحقیقت مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ (ترجمان القرآن بابت محرم ۱۳۶۰ھ) لیکن پاکستان میں پہنچ کر ان کے نزدیک جمہوریت عین مطابقِ اسلام قرار پا گئی اور اس میں کافر اور مسلم کی تمیز بھی ختم کر دی گئی۔ چنانچہ مودودی صاحب نے صدر ایوب کے دور کے انتخابات کے زمانے میں ایک تقریر میں فرمایا تھا کہ:

> اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ سے

مطابق ہونا چاہیئے۔ (امروز - ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

یہ تھی وہ جمہوریت جس کی بحالی کیلئے انہوں نے ۱۹۶۸-۶۹ء کی مہم کو عین تقاضائے اسلام قرار دیا تھا یعنی وہ نظام جس میں فیصلے اکثریت کی آراء کے مطابق ہوں خواہ یہ اکثریت مسلمانوں اور کافروں کی مخلوط ہی کیوں نہ ہو۔

اکثریت کے فیصلوں کے برحق ہونے کا یہی اصول ان کے نزدیک قانون سازی کے سلسلہ میں بھی کارفرما ہوگا۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آیا کہ ملک میں کونسا قانون شریعت نافذ ہوگا تو انہوں نے فرمایا کہ۔

اگر شریعت کو ملک کا دستور اور آئین بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کرسکتا) تو جمہوریت کے مسلّم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور آئین کی شکل اختیار کریگی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔۔۔ لہٰذا اسکا قانون حنفی تعبیر شریعت پر مبنی ہوگا۔

(ترجمان القرآن بابت جون - جولائی ۱۹۵۲ء)

یہ اُس حنفی فقہ کی بابت کہا جارہا ہے جس کے متعلق اس سے پہلے خود مودودی صاحب لکھ چکے ہیں کہ:

اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے (سیاسی کشمکش حصہ سوئم صفحہ ۲۶)

یعنی ایک منجمد شاستر" ملک کو ملک کا قانون شریعت بنا دیا جائیگا کیونکہ اسے جمہوریت کے مسلّم قاعدہ کی رُو سے اکثریت کی تائید حاصل ہے" ؟ یہ "مسلّم قاعدہ" بہرحال مغربی جمہوریت ہی کا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے۔ خود مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ:

اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلہ میں برحق ہو اور اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی۔ صفحہ ۴۵)

اس کے باوجود، کہا یہ جارہا ہے کہ جس قانون کو اکثریت کی تائید حاصل ہوگی وہی ملک کا قانون بن سکے گا کیونکہ جمہوریت کے مسلّم قاعدہ کا یہی تقاضا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ آئین میں لفظی طور پر" خدا کی حاکمیت" کتاب وسنت اور حدود اللہ" جیسے مقدس الفاظ شامل کرنے والوں کے ذہن میں عملی جمہوریت کا نقشہ کیا ہے اور اس میں کس طرح مسٹر اور مولانا میں کوئی تمیز و تفریق نہیں۔ زبانی خدا کی حاکمیت کے الفاظ دھرانے اور عملاً اکثریت کے فیصلوں کو حرفِ آخر قرار دینے والوں کو دیکھ کر بار بار قرآن کریم کی وہ وعید یاد آتی ہے جسمیں اس نے کہا ہے کہ

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۔ (۴/۶۰)

کیا تم نے اس قوم کی حالت پر غور کیا ہے جو دعوے تو اس کا کرتی ہے کہ ہم وحی منزل من اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کے لئے آخری اتھارٹی غیر اللہ کی تسلیم کرتی ہے۔ حالانکہ انہیں واضح طور پر کہہ دیا گیا تھا کہ ایمان کے معنی ہر غیر خداوندی اتھارٹی سے انکار اور سرکشی ہے۔ غور کیجئے کہ شیطان ان لوگوں کو

کس طرح راہ راست سے بہکا دیتا ہے"۔ آئین میں خدا کی حاکمیت کے الفاظ کا اندراج اور عملاً اکثریت کے فیصلوں کی بالادستی پر ایمان" اگر اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے "تحاکم الی الطاغوت" نہیں تو اور کیا ہے؟

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ مغربی نظریہ اور نظامِ جمہوریت کس طرح اسلام کی نقیض ہے اور خدا کی حاکمیت اور حدود اللہ کے تصورات کس طرح اس میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ نظام یا جمہوری ہو سکتا ہے یا خدا کی حاکمیت پر مبنی۔ اور یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ خدا کی حاکمیت سے عملاً مراد کتاب اللہ کا اقتدارِ مطلق یا ساورنٹی ہے اور یہ بات بھی آپ نے سمجھ لی ہو گی کہ مسلمان اپنے آپ کو آزاد اسی صورت میں تصور کر سکتا ہے جب اس پر حاکمیت صرف کتاب اللہ کی ہو۔ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن

تو اس سے اس کا مطلب یہی تھا۔ اقبالؒ نے یہ بات مجملاً کہی تھی۔ قائداعظمؒ نے اس اجمال کی تفصیل ان زندہ جاوید الفاظ میں بیان کر دی جو میرے نزدیک اسلامی مملکت کے آئین کا سرنامہ ہونا چاہیئے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے۔

کہا جائے گا کہ جمہوریت یا ڈیموکریسی کے الفاظ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے بھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن خود ان کی مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس سے کہ ان کی مراد مغربی طرز جمہوریت کسی صورت میں نہیں ہو سکتی تھی اس سے ان کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ ہمارا طرز حکومت آمریت (ڈکٹیٹرشپ) نہیں ہو گا۔ بایں ہمہ غلط اصطلاحات کی وجہ سے پیدا شدہ تخریبی نتائج کا جو عملی تجربہ ہمیں یہاں ہوا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اگر اس اصطلاح کو نہ ہی استعمال کرتے تو اچھا تھا۔ بہر حال انہوں نے اسے استعمال کیا تھا کیا اور اگر استعمال کیا تو کن معانی میں" اس سے ہمارے موقف پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ہمارے نزدیک سند اور حجت خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا قول۔ اس لئے خدا کی کتاب کے خلاف اگر کوئی شخص اقبالؒ اور جناحؒ کا بھی کوئی قول پیش کرتا ہے تو قرآن کی رو سے وہ سند نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں قول فیصل یہی ہے کہ۔

> ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآن کریم کے احکام و اصول ہی متعین کرتے ہیں (قائداعظم)

اسی کا نام اسلام ہے اور اسی کا نام آزادی۔

لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ کتاب اللہ کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔ اس نے ہر زمانے میں ہر اس شخص کی مخالفت کی جس نے ما انزل اللہ کو بطور سند اور حجت پیش کیا — خواہ وہ خدا کا

کوئی رسول تھا اور خواہ ان رسولوں کا کوئی متبع بشروع سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ یہ لوگ زبان سے کتاب اللہ کی حاکمیت کا انکار نہیں کرتے، ان کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ق ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ (۲/۷۹)

"خود قوانین وضع کرتے ہیں اور انہیں شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں"۔ اس طرح انسانوں کے وضع کردہ احکام وقوانین، کتاب اللہ کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کتاب اللہ ایک ہوتی ہے اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہوتی۔ (۴/۸۲)۔ وہ ہر اختلاف کو مٹاتی ہے۔ ([illegible]) لیکن وہ "شریعت" جسے مذہبی پیشوائیت خدا کے نام سے پیش کرتی ہے، مختلف انسانوں کی وضع کردہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں اختلافات ہوتے ہیں اور انہی اختلافات کی بناء پر امت مختلف فرقوں میں بٹ جاتی ہے اور چونکہ ہر فرقہ اپنی اپنی شریعت پر جم کر بیٹھا ہوتا ہے اور اسے کسی طرح بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اس لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ مملکت میں کوئی ایسا ضابطۂ قوانین نافذ کیا جا سکے جس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہو سکے۔ (چنانچہ مودودی صاحب نے کھلے بندوں اس کا اعتراف کیا ہے کہ "کتاب وسنت" کی بنیادوں پر کوئی ایسا ضابطۂ قوانین وضع نہیں ہو سکتا جس پر تمام فرقوں کا اتفاق ہو سکے) جدت پسند طبقہ جس پر کتاب اللہ کی پابندیاں "گراں" گذرتی ہیں نہایت اطمینان سے آئین میں حدود اللہ یا کتاب وسنت کے الفاظ درج کر دیتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ ان الفاظ نے کبھی عمل میں نہیں آنا۔ دوسری طرف مذہب پرست طبقہ بھی خوش ہوتا ہے کہ اسطرح کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین بن نہیں سکیگا اس لئے ہم اپنے اپنے فرقہ کو قائم رکھ سکیں گے۔ یہ ہے جو کچھ پاکستان میں چھبیس سال سے ہو رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسلام کے نام سے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ کبھی عمل میں نہیں آسکے گا۔ اس طرح یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ لوگ اللہ کو بھی دھوکا دیتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جو اس کی کتاب کی حاکمیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ (۲/۹) درحقیقت یہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس روش کا انجام کیا ہو گا۔

کیا کیا جائے؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطۂ سرزمین تک محدود نہیں رکھنا چاہتا اس لئے کہ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے تمام ممالک میں صورت حالات کم وبیش یہی ہے۔ اس لئے میں اپنے جواب میں یہ کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی محکومی اختیار کر کے، انسانوں کی ہر قسم کی محکومیت سے آزادی حاصل کرے۔ خواہ اس محکومیت کی شکل ملوکیت ہو یا آمریت، اور خواہ عصرِ حاضر کا جمہوری نظام ہو۔ اسے کرنا یہ ہو گا کہ:

۱۔ اپنے آئین میں اعلان کرے کہ اس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ قرآن مجید کو حاصل ہو گا۔

۲۔ مملکت کا فریضہ قرآنی احکام وقوانین، اصول واقدار کو عملاً نافذ کرنا ہو گا۔

۳۔ یہ بات امت (مملکت کے مسلمان باشندوں) کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول وقوانین

کو بحالت موجودہ نافذ کرنے کا طریقِ کار کیا ہو گا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلس مشاورت کو آپ پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہو گی کہ قرآن کریم کی رو سے مذہبی فرقہ سازی یا پارٹی بازی شرک ہے۔ پارلیمان کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط قرآنی احکام و اقدار سے واقفیت ہو گی۔

۴۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہو جائے کہ جو کچھ طے کیا جا رہا ہے وہ قرآنی تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں یا عام افرادِ معاشرہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کر رہی ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ میری بصیرت کے مطابق اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی بلند پایہ عدلیہ کے ارکان، ممتاز قانون دان حضرات اور قرآن کریم پر گہری نگاہ رکھنے والے اربابِ علم و بصیرت پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جس کے سامنے اختلافی امور پیش ہوں۔ اس مجلس کے اراکین اس شرط سے مشروط ہوں کہ وہ کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ قرآن مجید کو آخری سند و حجت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ان اختلافی امور پر غور و خوض کے سلسلہ میں ملک کے مختلف اربابِ علم و دانش کے مشوروں سے استفادہ کریں اور اس کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ ان کا فیصلہ اس باب میں حرفِ آخر تسلیم کیا جائے۔ یہ اعتراض کہ اس طرح بالا دستی (SUPREMACY) پارلیمان کی نہیں بلکہ اس مجلس کی ہو جائے گی، بے معنی ہو گا۔ اس لئے کہ قرآنی نظام میں بالادستی نہ پارلیمان کی ہوتی ہے نہ کسی اور مجلس کی۔ اس میں بالادستی کتاب اللہ کی ہوتی ہے اور ان مجالس کا منصب صرف یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ معاملہ زیرِ نظر میں کتاب اللہ کا حکم کیا ہے۔ اگر کوئی حکومت ان کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے تو ایسی مجلس کو ایسے اختیارات اور قوت حاصل ہونی چاہیئے کہ وہ اُسے اس فیصلہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کر سکے، اور بصورتِ دیگر اسے برطرف کر سکے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "بغاوت بالحق" کہا جائے گا۔ یہ حق کسی اور کو حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ نہ کسی فرد کو نہ افراد کے مجموعہ کو۔

یہ ہے میری بصیرت کے مطابق اس طریق کا مختصر سا خاکہ جس کی رو سے اس مملکت میں کتاب اللہ کی حاکمیت قائم ہو سکے گی اور اس کے بعد وہاں کے افرادِ معاشرہ بہ ہزار سرفرازی یہ کہہ سکیں گے کہ ہم دنیا میں کسی کے محکوم نہیں۔ ہمیں حقیقی آزادی حاصل ہے اور اس وقت اقبال کے اس پیغام کا عملی مفہوم بھی سمجھ میں آ سکے گا کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ✦ ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور یہی تھا وہ سجدہ جسے وادیٔ ضجنان میں ادا کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ ایک دن وہ تھا کہ میں اس وادی میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت گیر تھا۔ کام بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔ اور آج یہ کیفیت ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔ یہی مفہوم ہے قرآن کریم کی اُس آیۂ جلیلہ کا جس میں کہا گیا ہے کہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (۹۶/۱۹) "سجدہ کر اور قریب ہو جا" اسی سے آدمی کو مقامِ انسانیت حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے اُسے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ کی جنت کی زندگی حاصل ہوتی ہے جس میں نہ کسی قسم کا خارجی خطرہ ہوتا ہے نہ کسی رنج کا داخلی حزن و ملال — ایک خدا کے

سامنے جھکنا اور دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت کے آگے سے سکندرانہ جلال اور قلندرانہ اداؤں کے ساتھ مستانہ وار گزر جانا۔ نے غلام اور یا دادکس را غلام۔ واضح رہے کہ قرآنی تعلیم کی غایت الغایات احترامِ آدمیت کا تحفظ اور شرف و مساواتِ انسانیہ کی حمایت و ضمانت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان کسی انسان کے ہاتھوں ذلیل نہ ہو۔ اور یہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہ ہو۔ ہم ہر روز نماز کی ہر رکعت میں خدا کے متعلق یہ اعتراف و اعلان کرتے ہیں کہ وہ "مالکِ یوم الدین" ہے۔ سورہ انفطار میں ہے کہ تم یہ الفاظ تو دہراتے رہتے ہو کہ "خدا مالکِ یوم الدین" ہے لیکن مَا اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ تمہیں معلوم بھی ہے کہ یومُ الدین ہے کیا؟ یہ بات تمہیں خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔ سنو، اور غور سے سنو۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۔ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ۔ (۸۲/۱۹)۔ "یہ وہ دور ہے جس میں کسی فرد کو کسی دوسرے فرد کے لئے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا اور حکم صرف ایک خدا کا چلے گا"۔ یہ ہے عزیزانِ من! وہ آزادی جو قرآن عطا کرتا چاہتا ہے اور یہ ہر شخص کا پیدائشی حق ہے۔ اس حقیقتِ کبریٰ کو حضرت عمرؓ نے ایک نہایت جامع اور بلیغ فقرہ میں ادا کر دیا۔ بات یوں ہوئی کہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے نے، ایک غیر مسلم ذمی (قبطی) کی کسی بات سے ناراض ہو کر اسے کچھ بید مارے، یہ کہتے ہوئے کہ تو بڑوں کی اولاد کے حق میں گستاخی کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے گورنر، اُس کے بیٹے اور اُس ذمی تینوں کو بلا بھیجا۔ اس ذمی کے ہاتھ میں بید دیا اور کہا کہ گورنر کے بیٹے کو اسی طرح پیٹ جس طرح اُس نے تجھے پیٹا تھا۔ وہ اسے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ ہاں! پیٹ بڑوں کی اولاد کو۔ اس کے بعد آپ نے غضب آلود نگاہوں سے گورنر کی طرف دیکھا اور اُس سے وہ فقرہ کہا جسے تاریخ میں ثبتِ دوام حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا "عمرو! تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنانا شروع کر دیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔ یہ ہے وہ آزادی جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے اور جس کے تحفظ کے لئے انسانوں کی حکمرانی کے بجائے قانونِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن کے اسی تصورِ حکومت سے متاثر ہو کر مشہور فرانسیسی مفکر برگساں نے کہا ہے کہ "حکومت کا اقتدار انسانوں پر نہیں، اشیاء پر ہونا چاہیئے۔ تاکہ ایک انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اختیار نہ ہو" اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کے مشہور مصنف بریفالٹ کے الفاظ میں:

> ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار، خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، استبداد ہے۔ قوت کسی شکل میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا بچہ قوت کی، دولت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی۔ دفاتری زندگی میں کسی افسر کی ہو یا حاکم کی۔ کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے اور ان سب میں زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے زور پر اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (صـــ263)

اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اقتدار صرف قوانینِ خداوندی کو حاصل ہو۔ اسی کا نام آزادی ہے۔

آخر میں، میں اتنی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ جو مملکت بھی خدا کی حاکمیت کا اقرار کرے، خواہ وہ اقرار لفظی

مملکت پاکستان کی حفاظت

ہی کیوں نہ ہو، اس کی سرزمین کی حفاظت مسلمان کا دینی فریضہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ خطہ زمین محفوظ رہے گا تو خدا کی حاکمیت کے زبانی دعوے کے عملی صورت اختیار کرنے کا امکان ہو گا۔ لیکن اگر وہ خطۂ زمین ہی محفوظ نہ رہا تو خدا کی حاکمیت قائم کہاں ہو سکے گی؟ آج کوئی مسلمان اسپین کی سرزمین میں خدا کی حاکمیت کا نام تو لے کر بتائے!

لیکن (بفرض محال) اگر یہاں خدا کی حاکمیت کا آئینی اقرار نہ بھی ہو، تو بھی اس مملکت کا تحفظ بہرحال ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہاں کی بدسے بدتر زندگی بھی ہندو کی بالواسطہ یا بلاواسطہ غلامی سے بہرحال بہتر ہو گی۔ لہٰذا جہاں تحریک پاکستان کے دوران اس قسم کے نعرے نہایت شرانگیز تھے کہ:

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے ۔۔۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کو بھی کوئی اہمیت حاصل نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔
>
> (ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن۔ بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ)

اسی طرح آج بھی اس قسم کے خیالات کا عام کرنا کم تباہی کا موجب نہیں کہ ہمارے مستقبل کی حفاظت کی ایک ہی صورت ہے کہ پاکستان، بھارت کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ خواہ اس میں ضم ہو کر یا کنفیڈریشن کے ذریعے۔ ایسا کہنے والے اسلام ہی کے نہیں، ہمارے بہ حیثیت انسان زندہ رہنے کے بھی دشمن ہیں۔ یاد رکھیے۔ یہ خطۂ زمین محفوظ ہے تو اسلام کے دوبارہ زندہ ہو جانے یا ہمارے بہ حیثیت انسان باقی رہنے کے امکانات ہیں۔ اور اگر (خدانکردہ) ۔۔۔ رہا نہ یہ تو نہ سوز خودی نہ ساز حیات۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے معاشرہ میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے لیکن اس سے بڑھ کر احمق کون ہو گا جو مایوسی سے مغلوب ہو کر، راستے میں بگڑ جانے والے موٹر کو آگ لگا دے۔

والسلام

REFERENCES

1. The Individual, The state and world Govt: ..P.116
2. The Crisis of the Modern World P.106
3. Social Justice P.161
4. ----- Do ---------- P.131
5. ----- Do ---------- ....P 3
6. ------Do ---------- P.9
7. Justice and the Social order] Quoted in Social Justice .} P.28

حقائق وعبر

بے غیرتی کی انتہا!

لاہور سے، آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس، کے زیر اہتمام ایک مجلہ شائع ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیم۔ اس کی اشاعت بابت جولائی۔ اگست ۱۹۷۳ء میں محمد یوسف نامی ایک صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "یزیدی المیوں کا پس منظر" اس میں انہوں نے مدینہ منورہ پر یزیدی فوج کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ــــ لیکن ٹھہریئے۔ قبل اس کے کہ آپ اس اقتباس کو پڑھیں، ہماری طرح، سینہ پر پتھر رکھ لیجئے اور شرم اور غیرت سے کہیے کہ وہ اپنی آنکھیں جھکا لے۔ اس میں کہا گیا ہے:

> اس فتنہ میں سترہ سو (۱۷۰۰) صحابہؓ، مہاجرین وانصار، علماء، تابعین اخیار کو شہید کر دیا گیا۔ سات سو (۷۰۰) حفاظ قرآن شہید کئے گئے۔ قوم قریش کے ۹۷ افراد شہید ہوئے۔ دس (۱۰) ہزار مدینہ منورہ کے شہری شہید کر دیئے گئے اور یوں کل بارہ ہزار چار سو ستانوے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے گئے۔ اسی پر بس نہ تھا۔ ان بدبخت، غیر مسلم فسادیوں نے فسق، فساد، زنا اور لوٹ کو مباح قرار دے دیا۔ جہاں قتل معمولی بات ہو۔ وہاں مال اور آبرو لوٹنا اس سے بھی معمولی بات ٹھیری۔ انہوں نے مدینہ منورہ کی مسلمان عورتوں کو اپنی حوس شہوت مٹانے کے لئے تختہ مشق بنایا۔ اور ان کی اس کاروائی کے نتیجے میں ایک ہزار عورتوں نے اولاد زنا کے بچے جنے۔ (جنگ عظیم ثانی میں عیسائیت کے نام لیوا امریکی سپاہیوں کے زنا کی بدولت لاکھوں جرمن جاپانی اطالوی اور انگریز عورتوں نے لاکھوں حرامی بچے جنے جواب ہپیوں کی شکل میں دارالاسلام پاکستان میں مسلمانوں کی چھاتیوں پر مونگ دلتے نظر آتے ہیں) مؤرخ یعقوبی کے بیان کے مطابق ان بدبختوں نے مسجد نبویؐ میں گھوڑے باندھے۔ روضۃ من ریاض الجنۃ۔ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر اور قبر مبارک کے درمیان جگہ) پر گھوڑوں کی لید اور پیشاب پڑا رہا۔ اس قتل و غارت، لوٹ مار، آبروریزی کا حاصل یزید کی بیعت تھی۔ بیعت کے الفاظ تھے "یزید چاہے تم کو بیچے چاہے آزاد کرے، چاہے خدا کی عبادت کی طرف بلائے، چاہے معصیت کی طرف بلائے تم اس کی اطاعت سے منہ نہ موڑو گے" جو یہ بیعت نہ کرتا تھا اسے اسی وقت شہید کر دیا جاتا؎

؎ محبوب القلوب، شاہ عبدالحق محدث دہلوی۔ ص ۔ ۵۹ ۔

> تھا۔ مدینہ منورہ ان دنوں آدمیوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ پھل پھول صحرائی جانوروں کے نصیب ہوتے۔ مسجد نبویؐ میں کتوں کا بسیرا تھا۔

یہ ۶۳ھ کا واقعہ بتایا جا رہا ہے۔ یعنی رسول اللہ کی وفات کے صرف پچاس سال بعد کا۔ اور محل وقوع ہے۔ مدینۃ النبیؐ جس میں اس زمانے میں صحابہ کبارؓ موجود تھے اور باقی آبادی تابعینؒ پر مشتمل تھی۔ آپ نے اس قسم کے واقعات سے یزید اور اس کی فوجوں کا جو نقشہ پیش کیا اُسے چھوڑیئے۔ لیکن اس سے آپ نے مدینہ منورہ میں بسنے والے صحابہؓ اور تابعین کا جو کیریکٹر پیش کیا ہے اس پر بھی غور فرمایا؟ (معاذ اللہ) ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی عصمت مآب بہو بیٹیوں، بیویوں، ماؤں بہنوں کی عصمت دری ہو رہی ہے۔ اور اس حد تک کہ ایک ہزار خواتین کو حرام کا حمل ٹھہر جاتا ہے اور وہ زنا کے بچے جنتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھتے ہیں اور خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ نہ ان مردوں کے دل میں غیرت کروٹ لیتی ہے نہ ہی وہ خواتین (جو انہی کے پایہ کی تھیں) اپنی مدافعت کے لئے کچھ کرتی ہیں: مسجد نبویؐ میں حضورؐ کے منبر اور روضہ اطہر کے درمیان گھوڑوں کی لید اور پیشاب پڑا ہوا بہتا ہے اور وہاں کتے بسیرا کر لیتے ہیں اور اُمت کچھ نہیں کرتی!

آج — کے گئے گزرے زمانے میں بھی (جبکہ ہم اپنی پستیٔ کردار کا ہر وقت رونا روتے رہتے ہیں) مسلمانوں کی غیرت کا یہ عالم ہے کہ کسی مسجد کی ذرا سی بے حرمتی کی بات سننے میں آئے، وہ جانیں دینے کے لئے باہر نکل آتے ہیں۔ کانپور کی مسجد کا غسل خانہ مسمار (شہید) کرنے کی اسکیم تھی ناں جس سے ہندوستان کے محکوم مسلمانوں نے سارے ملک میں آگ بھڑکا دی تھی! اسی لاہور میں مسجد شہید گنج کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے جس جانفروشانہ جذبہ کا اظہار کیا تھا، وہ ابھی کل کا واقعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسجد کی بے حرمتی کے سلسلہ میں مسلمانوں کی غیرت کی آج یہ کیفیت ہے، تو کیا مدینہ طیبہ کے صحابہؓ اور تابعینؒ کے دلوں میں اتنی بھی غیرت نہیں تھی؟ باقی رہا (معاذ اللہ) بے محابا عصمت دری کا واقعہ (جسے مودودی صاحب نے بھی اپنی رسوائے عالم کتاب — خلافت و ملوکیت — میں درج کیا ہے) سو اگر ہمیں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے ارباب نظم و نسق، اور مجلہ اسلامی تعلیم سے متعلق حضرات معاف فرمائیں، تو ہم ان سے اتنا پوچھنے کی جرأت کریں گے کہ اگر (خدانکردہ) اس قسم کی بہیمیت کے ارادے سے کسی فوج کے سپاہی آپ کے گھر کا رخ کریں تو آپ کا ردِ عمل کیا ہو گا؟ کیا آپ یا آپ کی محترم خواتین ایسا ہونے دیں گی، اور اگر بے بسی کی وجہ سے اور کچھ نہیں ہو سکے گا، تو کیا آپ اور آپ کی خواتین اپنی جانیں نہ دے دیں گی؟ سوچئے کہ کیا اُن حضرات کے سینوں میں اتنی سی غیرت بھی نہیں تھی! اس زمانے کے مسلمان کو تو چھوڑیئے، اس قسم کی بے غیرتی تو زمانہ جاہلیت کے عربوں کے ہاں بھی نہیں تھی! تو کیا زمانہ جاہلیت کے عربوں کو، اسلام نے (معاذ اللہ) ایسا بے حمیت بنا دیا تھا؟ پھر اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ اس زمانے میں صورت یہ نہیں تھی کہ فوج کے پاس ٹینک توپیں ہوائی جہاز تھے اور مدینہ کے رہنے والے نہتے تھے۔ اس زمانے میں نہ کوئی (STANDING ARMY) ہوتی تھی نہ آدمی کے پاس کوئی مختص ہتھیار۔ ساری اُمت فوج تھی اور ہر ایک کے پاس ایک ہی قسم کے ہتھیار۔ کیا ان حالات میں بھی مدینہ طیبہ کے باشندے، یہ سب کچھ خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہے ہوں گے!

اس کے جواب میں کہہ دیا جاتا ہے (اور مودودی صاحب نے بھی کہا تھا) کہ یہ کچھ ہم اپنے گھر سے نہیں لکھتے۔ ہماری کتب تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے ہم اس کی پیش کرتے ہیں! ٹھیک ہے کہ ہماری کتب تاریخ میں یہ کچھ لکھا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ کتابیں وحی منزل من اللہ ہیں جن کے من وعن صحیح تسلیم کرنے کے لئے ہم از روئے ایمان مکلف ہیں! یہ بہرحال انسانوں کی تالیف کردہ کتب تاریخ ہیں جن میں صحیح اور غلط ہر قسم کے واقعات درج ہیں۔ جب ان کی حیثیت یہ ہے تو ہمیں ان پر نقد و نظر کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اگر آپ ان میں درج شدہ کسی غلط واقعہ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں تو آپ اس کے جواب دہ ہوتے ہیں کہ آپ اسے صحیح کس طرح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ یہ کہکر نہیں چھوٹ سکتے کہ میں نے اسے فلاں کتاب میں درج پایا ہے۔ قدرت نے آپ کو جو قوت تمیز عطا کی ہے وہ کس مصرف کے لئے ہے؟ ہماری حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مغربی مستشرق اپنی کسی کتاب میں، اپنی کتابوں میں سے کچھ نقل کر کے درج کر دیتا ہے تو ہم اس کے خلاف قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ اور جب تک اس کی کتاب کو ضبط نہیں کرا لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔ لیکن خود وہ کتابیں جن سے اس قسم کا مواد لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں مقدس قرار پاتی ہیں اور ان سے ہم دھڑا دھڑ وہ سب کچھ اپنی کتابوں اور رسالوں میں نقل کئے جاتے ہیں جنہیں مستشرقین کی کتابوں میں دیکھ کر ہم نعل بر آتش ہو جاتے ہیں۔ ہم "اسلامی تعلیم" کے ذمہ دار حضرات سے پوچھتے ہیں کہ جو کچھ آپ کے ہاں درج ہو گیا ہے، اگر یہی کچھ کسی مستشرق کی کتاب میں درج ہوتا تو اس کے خلاف آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟

اور یہ ہے نمونہ اسلام کی اس تاریخ کا جسے ہم اپنے نصاب کی کتابوں میں فخر سے شامل کرتے ہیں اور پھر روتے ہیں کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے سرکشی کیوں برتتا جا رہا ہے۔ یاد رکھئے جب تک ہم اپنی تاریخ کی تنقیح کر کے اسے از سر نو مرتب نہیں کرتے، ہم دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں ہو سکتے! ہماری تاریخ کا بیشتر حصہ ایک بہت بڑی سازش کے تابع وضع کردہ افسانوں پر مشتمل ہے۔

۲- آزادی حاصل ہو گئی

کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ جسارت کی ۲۷ جولائی کی اشاعت میں شائع شدہ ذیل کی خبر ملاحظہ فرمائیے۔

> سکھر ۲۵ جولائی گورنمنٹ کالج کمپری ہینسو پائی سکول اور اسلامیہ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے امتحانات کے دوران طلبہ کو اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے پرچے حل کریں۔ کتابیں رکھیں یا باہر سے پرچے لا کر نقل کریں۔ لیکن مشکل پرچہ ہونے یا آوٹ آف کورس کہہ کر امتحانات کا بائیکاٹ نہ کریں جس کی وجہ سے ان امتحانی مراکز پر کھلے عام نقل جاری ہے جس کی وجہ سے دوسرے محنتی طلبہ مایوسی کا شکار ہیں۔ یہ بات ایک نگران پروفیسر نے اس وقت بتائی جب کہ وہ امتحان ہال سے کتابوں کے ڈھیر لے کر واپس ہو رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ہم لوگ کسی طالب علم کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نقل کیوں کر رہا ہے بلکہ اگر اس کو نقل کرنے میں مدد نہ کریں

تو امتحان ہال میں بیٹھ نہیں سکتے۔ آؤٹ سائڈر طلبہ بڑی تعداد میں کلاسوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور نگران اساتذہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے جوابات لکھ کر دیں۔ بدمزاجا تو کھل کر انہیں دھمکاتے اور زدوکوب کرتے ہیں۔ پولیس سب کچھ دیکھتی ہے لیکن وہ بھی ان طلبہ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتی۔ ایک نگران ٹیچر نے جب نقل کرانے سے انکار کر دیا تو طلبہ نے اس کا منہ کالا کر کے میز پر بٹھا دیا اور تماشا بنا یا جبکہ گذشتہ روز تو کچھ لڑکیاں اپنے بھائی کو نقل کرانے کالج پہنچ گئیں اور انہوں نے باقاعدہ پرچہ حل کرایا ان کے ساتھی طلبہ نعرے لگاتے رہے۔ اور انتظامیہ کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔

لسان العصر اکبر (الہ آبادی) نے انگریز کے طرزِ تعلیم سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اگر اکبر آج زندہ ہوتے تو معلوم نہیں کیا کہتے؟ ویسے یہ اچھا ہی ہوا کہ یہ لوگ اس دور سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

۳۔ شرم ہم کو مگر نہیں آتی

پاک۔ بھارت مذاکرات میں بھارتی وفد کے قائد اور وزیراعظم اندرا گاندھی کے پرسنل سیکرٹری مسٹر ہکسر نے پاکستان سے واپسی کے بعد آل انڈیا ریڈیو کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے متعلق کہا کہ:

اسلام قیام پاکستان کی اساس تھا۔ قیام پاکستان کے بعد فوج، سول سروس اور مملکت کے دیگر لوازمات کو مستحکم بنانے کی کوششیں کی گئیں لیکن بنیادی اساس اور اس رشتہ کو جو پاکستان کے مختلف علاقوں کو متحد رکھ سکتا تھا نظر انداز کیا گیا جس کے نتیجہ میں پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے۔

(بھارت ۔ ۳ اگست ۱۹۷۳ء)

فرمایئے! دل کے تہ خانے سے ندامت کی کوئی آواز ابھری؟ ہوئی یہ حقیقت معلوم کہ پاکستان کے ٹکڑے کیوں ہوتے ہیں؟

۴۔ سید جمال الدین افغانیؒ کا پیغام

جزائے عمل اور ثمرِ سعی قدرت کے دو فیاضانہ عطیے ہیں۔ لیکن وہی قوم خدا کی بخشش کا اپنے آپ کو مستحق ٹھہرا سکتی ہے جو اسلام کو جمود کا عقیدہ برعادہ نہیں سمجھتی بلکہ عمل و سعی کا ایک قابلِ تسلیم دستور مانتی ہے۔ میں دعا اور اس کی تاثیر کا قائل ہوں۔ لیکن صرف دعا سے ہی کسی قوم کی قسمت نہیں بدل سکتی۔ باب تاثیر صرف اسی شخص کی صدا کا منتظر ہے جو شمشیر اٹھا کر کہتا

(باقی ص ۶۴ پر)

علامہ مشرقی (مرحوم) کی یادیں

علامہ عنایت اللہ خان المشرقی (مرحوم) علمی دنیا میں ایک نابغہ روزگار ہستی تھے اور تحریکِ خاکساران کے بانی اور امیر۔ لیکن ہمارے دل میں ان کا احترام' ان کی مایہ ناز تصنیف — تذکرہ — کی بنا پر ہے جس نے ہمارے زمانے میں' خدا کی عظیم کتاب قرآن مجید کے حقائق کا آغاز منفرد انداز سے کیا۔ تذکرہ کی جلد اوّل آج سے قریب پچاس سال پہلے شائع ہوئی اور علامہ مرحوم نے بتایا کہ انہوں نے اسے بارہ مجلدات میں مکمل کر لیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ بقایا جلدیں منصۂ شہود پہ نہ آسکیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کا کیا ہوا' لیکن اتنا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ شائع ہو جاتیں تو یہ علامہ مرحوم کا ایسا انقلاب آفریں کارنامہ ہوتا جس سے ان کا نام بقائے دوام کا مستحق قرار پا جاتا۔

ہر سال اگست میں ان کی برسی منائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سے بھی کہا گیا ہے کہ ہم ان کی یاد تازہ کرائیں۔ ہمارے نزدیک ان کی یاد تازہ کرانے کا اس سے بہتر طریق اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی معرکہ آراء تصنیف — تذکرہ — کے چند ایک اقتباسات پیش کئے جائیں۔ سو وہ حاضرِ خدمت ہیں۔ ہم نے طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۶۰ء میں ان اقتباسات کو درج کرنے کے بعد لکھا تھا کہ اس کتاب کے مصنف کو ہمارے "علمائے کرام" نے حسبِ عادت، کفر کے فتوے سے نواز اتھا! یا للعجب!!

تذکرہ کے اقتباسات

جو بات حتمی اور قطعی ہے یہ ہے کہ زمین کا یہ کارگاہ جلیل کُشاں عدل و انصاف پر چل رہا ہے' صحت اور توازن سے چل رہا ہے' دھڑلّے اور تمکنت سے' قوّت اور تدبر سے چل رہا ہے۔ اس میں جو بات ہو رہی ہے نقد و نظر سے ہو رہی ہے۔ انتخاب و انتظام سے ہو رہی ہے' نظم و نسق سے اور غور و خوض سے ہو رہی ہے۔ اس کا محرک جل و علیٰ وہ مالک سمیع و بصیر ہے جو ہر شئے کو بغور تمام دیکھ رہا ہے' پہنائے زمین کو دیکھ رہا ہے' نسلِ انسانی کو دیکھ رہا ہے' اُمتوں کے اعمال کو دیکھ رہا ہے' افراد کے سعی و عمل کو دیکھ رہا ہے' بد و نیک کو' کہ و مہ کو' شاہ و گدا کو' بالا و پست کو دیکھ رہا ہے! اس منظم اور مضبوط' اس لرزہ فگن اور صحیح حکومت

(۱) دین

کے اندر استبداد کی بو قطعاً نہیں ظلم قطعاً نہیں، افراط و تفریط قطعاً نہیں، لوابی کی لاابالیت اصلاً نہیں! میرا یقین ہے کہ ملکوت جہاں کی اسی اہم شق کا علم سب انبیائے کرام کو ملا، اور اسی آئین جزا و سزا کی خبر انہوں نے ڈنکے کی چوٹ دی۔ انہوں نے انسان کو اس زمین پر خوش اسلوبی سے رہنے کا ڈھنگ سکھلایا، انہوں نے اجتماعی بقا کی راہ دکھلائی، انہوں نے اقوام کے مدّوجزر کے اصول بیان کئے، حکومت خدا کو ظلم سے قطعاً بری ثابت کر کے دنیاوی سزا کی تعیین کی، اُخروی جزا و سزا کی تبیین کی، افراد کے طرزِ عمل کو ظاہر کیا، اُمتوں کو راہِ راست پر چلا کر صدیوں تک تمکن اور دوام دے گئے، نافرمانوں کو ان آنکھوں سے سزا ملتی ہوئی دکھا گئے! یہی ان کا لایا ہوا دین تھا، اور اسی دین (طرزِ عمل) پر چلنے کا خدا متمنی تھا۔

---

(۲) مقام نبوت

انبیاءؑ کو فطرت کے اس محکمۂ کبریٰ کا علم ان کی بے مثال بصیرت کے باعث ملا[1]! اس کارگاہ جہان کو بحیثیت مجموعی اور اجتماعی نظر سے دیکھ کر ملا! کمال غور و انہماک سے ملا! وسیع نظری اور بلند بینی سے ملا! تعلّم کے بامِ بلند، اور تدبّر کے افق اعلیٰ پر چڑھ کر ملا! زمین سے کئی منزلیں بلند ہو کر بلکہ ستاروں کی رصد گاہوں پر پہنچ کر ملا! نہیں آسمان سے اور آسمان پر بسنے والے، خدا سے ملا! وحی اور نبوّت سے، عجز اور عشق سے، تدلّی اور تکلّم سے ملا! نبیؑ کی نبوّت اس کے اپنے زمانے میں وہ لرزہ فگن اور سکون بر انداز شئے تھی کہ جو گروہ ان کے حلقۂ اثر میں آجاتا تھا اُن کے کہے پر یکسر عامل ہو جاتا۔ وہ رہنمائے جلیلؑ اپنے گردوں شگاف علم اور پیہم عمل سے، اپنی یقین انگیز تعلیم اور حوصلہ افزا تدریس سے، اپنی پردہ کشا تبیین و تلقین سے قانونِ خدا اور اس کے امن افزا نتائج کو ہر مصاحب کی نظروں میں دو اور دو چار کی طرح عیاں کر دیتا، پھر عاملوں کا جم غفیر پروانہ وار اس کے گرد جمع ہو جاتا، اقل قلیل مدّت میں وہ اُمت کامیاب اور فائز المرام ہو جاتی اور سعی و عمل کے اس دار المحن میں آئندہ نسلوں کو بہترین عمل کی راہ دکھلاتی!

کیا وہ سالار انبیاء اور ختم رسل محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام جس کے آسمان شگاف علم و عمل کو دیکھ کر رحمت ایزدی کا موسلا دھار مینہ روئے زمین کو ابد الآباد تک تر بہ تر کرتا رہے گا، جس کے قانونِ بقا و فنا کی تبیین کو پا کر برّ و بحر اور شمس و قمر اس پر سلام بھیجتے رہیں گے، جس کی قوتِ تغیر و انقلاب کا اندازہ کر کے مسِ خام کو کندن بننے کی دائمی آرزو رہے گی، کیا وہ سرورِ عالمؐ فی الحقیقت ایک کنج نشین اور کملی پوش، ایک بیعلم اُمّی اور ناراز دان زاہد، ایک نماز گذار متوکّل اور فاقہ کش متقی، ہی تھا جس نے ایک اقل قلیل مدّت میں عرب کی بے نام و نشان اور جمود زدہ قوم سے علم و عمل کے وہ آتشیں فوارے اکناف عالم میں رواں کئے کہ دنیا ہمیشہ تک اُن کے کارناموں کو سن کر سر دھنا کرے گی!

---

(۳) قرآن کریم

روئے زمین کے آسمانی کتب خانے میں لے دیکر صرف ایک قرآن ہے جو سب انسانی تصرف سے محفوظ رہا ہے، اس میں ایک حرف کے برابر بھی تبدیلی نہیں ہوئی، الفاظ

---

[1] یعنی علم وحی تو نبی کو وہبی طور پر ملتا ہے لیکن جسے ملتا ہے اس کی بصیرت بھی بہت بلند ہوتی ہے۔ (طلوع اسلام)

کی ترتیب میں، آیتوں کے الفاظ ہیں، سورتوں کی آیتوں میں یہ کتاب بعینہٖ وہی ہے۔ جو پیغمبر آخر الزمانؐ نے دنیا کو دی۔ کسی تساہل، کوتاہ نظری، بددیانتی یا غرض مندی اس کو پہلے دن سے نقل کرنے میں نہیں ہوئی بلکہ اس کے ایک پرانے نسخے کے متعلق جدید انکشاف جو حال میں ہوا ہے اس نے علماً اور عملاً ثابت کر دیا ہے کہ یہ وہی ہے جو پہلے تھی، وہی ترتیب ہے جو ایک دفعہ مقرر ہو چکی تھی۔ وہی نقش ہے وہی الفاظ ہیں، سینوں کے جوف میں ہے تو وہی ہے، اور کاغذ کے سینہ پر ہے تو وہی ہے!

وحی کی سچی قدر، اس پر سچا اور پختہ یقین، اس پر مسلسل اور نتیجہ خیز عمل، اس پر کامل اور لاینفک اتحاد درحقیقت علم ہی سے ہو سکتا ہے، اور وہی صراط مستقیم صحیح معنوں میں بقا انگیز اور تقدم خیز ہے جس کے مسلمہ اصول کی تائید براہ راست وحی سے ہوتی۔

مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اس قانونِ خدا اور امر رب العالمین کی حقیقت تک بتمام و کمال پہنچنے کیلئے قرآن حکیم سے بہتر، کامل تر، واضح تر اور صحیح تر آسمانی کتاب اس دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ سب آسمانی صحیفے اپنے وقت نزول سے آج تک کم و بیش لفظی تحریف کا شکار ہو چکے ہیں، ان میں سے اکثر کے الفاظ تو روئے زمین سے کلیتاً ناپید ہیں، اکثر میں مرورِ وقت کے باعث ردّ و بدل وارد ہو چکا ہے حتّیٰ کہ خود حاملانِ وحی کو اس حقیقت کا اعتراف ہے، لیکن لفظی تحریف کا گناہِ عظیم انسان نے کم از کم اس کتاب کے بارے میں حتماً نہیں کیا۔ قرآن حکیم کے مطالب اور مقاصد میں اگرچہ بے حد معنوی تحریف ہو چکی ہے، اس کا اصلی اور نبوی منشا، جہلا اور علماء کی سفسطہ تاویل کے باعث اکثر خبط ہو گیا ہے، اس کے معانی پر بعید شرحی اور فقہی غلاف پڑ چکے ہیں، اس کے کبھی ایک امر مبہم کا الٰہی مفہوم صحیح طور پر مسلمانانِ عالم کے ذہنوں میں باقی نہیں رہا، اس کے اوامر و نواہی پر اعتقاد آج صرف اقوال اور افواہ تک محدود رہ گیا ہے، اس کو لوگ جو کچھ مان رہے ہیں مونہوں اور لفظوں، پھونکوں اور استخاروں سے مان رہے ہیں، لیکن اس کے الفاظ بعینہٖ اور باصلہ موجود ہیں۔ انسان کا بڑے سے بڑا فریب بھی اب ان کو بدل نہیں سکتا۔ ان کی کچھ کتر بیونت نہیں کر سکتا۔ محقق کے لئے اس کتاب کا روئے زمین پر موجود ہونا ایک غیر مترقبہ نعمت اس لئے ہے کہ صحفِ آسمانی کے اضافی مطالعے میں قرآن حکیم کے الفاظ اور تحقیق شدہ مطالب کی راہنمائی صحیح منشاءِ خدا کی طرف سچی رہنمائی ہے۔ جہاں اور سب کتبِ آسمانی اپنی موجودہ حالت میں کسی ایک امر کے بارے میں کوئی حکمی فیصلہ نہیں کر سکتیں، وہاں قرآن اس امر کے متعلق اپنا قطعی اور آسمانی فیصلہ دے سکتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ جو مشترک باتیں آسمانی صحائف میں اس وقت پائی جاتی ہیں، اور جن کا وجود اس آخری کتاب سے بھی ثابت ہے، ان سب کا قرآن صحیح معنوں میں مصدق بن جاتا ہے۔ اس مقام نظر سے اگر کسی مزعومہ آسمانی کتاب کے اکثر مضامین اور قرآن کے مابین کوئی مابہ الاشتراک ثابت ہو گیا ہے تو اس مزعومہ کتاب کا اس کے اپنے عہدِ نزول میں منجانب اللہ ہونا بھی متحقق ہے۔ الغرض مذہب کو علم کے بلند درجے تک پہنچانے کے لئے یہ گوہر نایاب از بس بیش بہا اور گراں مایہ ہے۔ طالبِ حقیقت کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ ان کے پاس کم از کم ایک ایسی کتاب موجود ہے جس کو خدا کے ہاں سے براہ راست ہونے کا ادعا ہے، اور جو نامحرّف اور بے غل و غش خالص ہے! اس (محقق) کا کام اب صرف اتنا ہے کہ اس کو علم کی

کسوٹی پرکھ حقہ، پرکھ کر سونا ثابت کر دے، یا اگر وہ اس محک پر پوری نہیں اتر سکتی[1] تو اس کا ناقص عیار ہونا علی الاعلان ثابت کر کے دنیا کو مذہب کے "فریب عظیم" سے یکسر نجات دلوا دے!

یہ وہ خیالات ہیں جن کی بنا پر میں اس کتاب کو ساکنانِ زمین کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ قرآن حکیم اپنی جامعیت اور مانعیت میں، اپنی محبت اور حکمت میں، اپنے علم و خبر میں وہ فقید المثال کتاب ہے کہ اس کا علم انسانی دانست کے ہر ممکن معراج سے بالاتر ہے۔ سب آسمانی کتابیں قانون خدا اور دین فطرت کے صرف بعض یا اکثر حصوں کو پیش کرتی ہیں مگر یہ نادر الوجود صحیفہ اس کو بہ تمام کمال پیش کر رہا ہے۔ انسانی معاشرت اور تمدن، دنیاوی بہبت اور امن، علمی تقدم اور عمران، عملی فوقیت اور اقدام کا کوئی شعبہ نہیں جس کو حاصل اور برقرار رکھنے کے لئے اس کے اندر مکمل اور معنی خیز اشارات نہ موجود ہوں۔ تہذیب کے ہر مرحلے میں، عمران کی ہر منزل میں، تقدم کے ہر قدم پر یہ کتاب انسان کے لئے سچی رہنما ہے۔ اس کی انگشت رہنما لامحالہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہے جس طرف بالآخر نقصان ہے، اجتماعی ضعف ہے، مجموعی موت ہے! اس کا سب سے خوف و خطر حکم اسی صراط مستقیم کی طرف ہے جس پر چل کر امن ہے، خلود و بقا ہے، نعمت اور عزت ہے! اس کا اہم ترین مطمح نظر آدمیوں کی اجتماعی حالت کی اصلاح ہے، لیکن اسی مجموعی بست و کشاد کے ضمن میں اس نے افراد کی شخصی فلاح کا اٹل دستور العمل بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کو روئے زمین پر بھیجنے والا وہ صاحب علم و خبر، وہ مالک سمیع و بصیر، اور وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے کہ بنی نوع انسان کے انتہائی ارتقا کو ہزاروں بلکہ لاکھوں برس پہلے دیکھ رہا ہے، صدہا برس کے گذشتہ واقعات کی سند پیش کر رہا ہے، امن کے لوازمات کی طرف اشارہ کر رہا ہے، خوف کے مقامات سے ڈرا رہا ہے۔ الغرض جو کہہ رہا ہے قوت اور زور سے کہہ رہا ہے، یقین اور وثوق سے کہہ رہا ہے، غنا اور بے نیازی سے کہہ رہا ہے! اس کا قانون اس قدر مکمل ہے کہ نارسا نظریں اس میں عیب نکالتی ہیں، اس میں کجی دیکھتی ہیں، اس کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں مگر علم کی وسعت اور بلند بینی پھر ان شکوک کو مشکوک کر دیتی ہے! ہر شک کے متعلق نئے اعمال، نئی معلومات، نئے مقام نظر آئے دن ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور مشکک کو بالآخر درماندہ اور سپر انداختہ کر دیتے ہیں! مقام نساء، تعدد ازدواج، ممانعت خمر، معاشری مساوات وغیرہ وغیرہ چند در چند ایسے مسئلے ہیں جن کے متعلق دنیا تمدن کے اس مرحلے میں مشکل سے یک رائے و یک زبان ہو سکے گی، ان پر جب تک انسانی فطرت کا علم نامکمل ہے بحث کا سلسلہ جاری رہ سکے گا۔ مگر ان مباحث دقیقہ کے متعلق قرآن کے قطعی اور حکمی فیصلے وہی ہیں جن پر دنیا کی عام رائے کا اہم ترین حصہ نامحسوس طور پر متفق ہو رہا ہے! وہ وہی ہیں جو تلخ تجربوں، فطری گناہ کی سزاؤں، پشتینی غفلتوں کے سم آلود نتیجوں، افراط و تفریط کے مہلک اور قاطع النسل اثرات اور ترقی علم سے اخذ ہو کر دنیا کو نئی راہوں پر لگا رہے ہیں! دنیا کسی کشمکش و پیچ میں گرفتار ہے، صراط مستقیم کی تلاش میں بہ غلط اور وہ صحیح بار بار کہتی رہی ہے، زید سے ہٹ کر عمرو کی طرف اور عمرو سے بکر کی طرف راجع ہو، مگر قرآنی مسائل کے ناقابلِ بدل اس لئے ہیں کہ بالآخر انسانی طبیعت انہی کی طرف مائل ہو کر رہے گی۔ اپنی فطرت سے بے خبر انسان

---

[1] جو ناممکن ہے۔ (طلوع اسلام)

انہی پر مجبول ہے، انہی سے ہٹ کر شکست و ریخت ہے، انہی پر چل کر حفظ و امن ہے! جہاں افسردگی ہے اسی کے عصیاں سے ہے! جہاں بالش ہے اسی کو مان کر ہے۔ قرآن کہتا یا ہوا اسلام ایک فطرت ہے جس پر سب نسلِ انسانی بلا امتیازِ رنگ و ملک مخلوق ہے، اس میں کوئی تبدل اور تحوّل اصلاً اور طبعاً نہیں ہو سکتا! یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کے سوا کوئی دوسرا خطِ مستقیم بداہتہً ممکن نہیں۔ البتہ اگر لوگ اس کی تلاش میں ایک راہ سے ہٹ کر دوسری راہ پر چل رہے ہیں تو اس کی وجہ کمیٔ علم ہے۔ جس دن فطرتِ انسانی کا علم مکمل ہو جائے گا، صراطِ مستقیم سورج کی کرنوں اور مہتاب کی شعاعوں سے زیادہ روشن تر حقیقت ہو جائے گی اسی بنا پر قرآن نے اپنے بتاتے ہوئے صراطِ مستقیم کے بارے میں کہا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (الروم ۳۰)

اس کا کمالِ عاطفت یہی ہے کہ اعلان کر دیا کہ یہ کتاب مکمل ہے، مفصّل ہے، گنجینۂ علم و حکمت ہے، انسان سے اس کا مثیل پیدا ہونا محال ہے، آسان ہے، مبین ہے، اختلاف سے مبرّا ہے، صاحبِ علم و فکر قوم کے لئے ہے، ہدایت اور رحمت ہے، نور و شفا ہے، سراپا طب ہے!

---

(۲) مادہ پرست یورپ کی غلطی

مغرب کے وارثانِ علم بھی آج اپنی تمام تحقیق و تدقیق کو اشیائے فطرت کے خواص اور اجسامِ کائنات کے حقائق کی تلاش میں وقف کر رہے ہیں، وہ اپنا سب زورِ سعی اس میں صرف کر رہے ہیں کہ ابدان کا صحیح علم حاصل کریں، اور اس کی وساطت سے ترقی کے بامِ رفیع پر چڑھیں۔ ان کا علم آج فلک الافلاک کی بلندیوں اور تحت الثریٰ کی گہرائیوں تک ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ فطرت کی وسعت اور دقّت پر، اشیا کی لامتناہی ممکنات اور راست افزا کیفیات پر ان کو یہ صبر گسل یقین ہے کہ کائنات کے ہر حجرہ علا تجربے کے اندر ان کو ایک پہاڑ پوشیدہ ہونے کا امکان نظر آ رہا ہے۔ وہ اس موشگافی اور دقیقہ آرائی میں عمریں صرف کر رہے ہیں، جانیں فدا کر رہے ہیں، حیرت انگیز اضافی قوت کی دوربینیں اور خوردبینیں دقیقہ رس آلات اور میزانیں اس آئینہ گاہِ فطرت کے ہر ذرّے کو بغور تمام دیکھ رہی ہیں، لیکن خدا کے کہے ہوئے الفاظ ان کے نزدیک کچھ لائقِ التفات نہیں، کچھ قابلِ تفتیش نہیں، کچھ مجمل اور حامل المعانی نہیں، کچھ دقّتِ نظر کے محتاج نہیں، کچھ دوربینی اور خوردبینی امتحان کے اہل نہیں! علم الابدان سے مغرب کو یہ انتہائی شغف ہے لیکن علم الادیان کی طرف یہ بے توجہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اشیائے فطرت کے بیمثال علم اور ابدانِ عالم کے متعلق صحیح خبر کے باوجود مغرب کا روئے زمین پر دوام ازبس مشتبہ امر ہے! وہ علم الدین سے کما حقہٗ بہت کم واقف ہیں، ان کو اس دنیا کے اندر صراطِ مستقیم کے ایک اہم حقیقے کی کچھ خبر نہیں رہی۔ سیاست اور مادیت کے نا روا غلو نے نامعلوم طور پر یہ بات ان کی گھٹی میں ڈال دی ہے کہ اس دنیا کے اندر اصلحیت، محض جسمانی زور اور مادی طاقت ہی ہے، یہی کمتر مخلوق کے اخلاق کا جزوِ اعظم ہے، اسی کے اندر بقائے انواع کا راز ہے! وہ اس مادی زور کو بدرجۂ اتم حاصل کرنے کے لئے سب ممکن اشیائے فطرت کو کرایہ پر لے رہے ہیں۔ اور ان کی وساطت سے زور آور بنتے ہیں لیکن

افراد کی روحانی صلاحیت اور تہذیبِ نفس کے آسمان شکن زور کی ان کو کچھ خبر نہیں، وہ اپنی باطنی ملکوتی طاقتوں کو مادیت کی بے جان قربان گاہ پر چڑھا رہے ہیں۔ اور بے رحم زمانے کے ہاتھوں جلد مٹ رہے ہیں۔ اسی غیر روحانی اور کرایہ پر لیئے ہوئے زور کا اشد شدید مبلغ المانیہ کی بے مثال جنگیت تھی جس کا بیشتر حصہ حال کے[1] محاربۂ عظیم میں تباہ ہوا اور اسی خواہش کا ادنیٰ مظہر انگریز کی قزاقانہ جوع الارض اور اس کا تحکمانہ استیلا ہے، جو آج اس کی اجتماعی بیخ و بنیاد کو کھوکھلا کر رہا ہے!

الغرض جہاں نقد پسند مغرب صلاحیت کو جسمانی قوت کی پیدا کی ہوئی سیاست کے ماسوا کچھ اور سمجھنا گناہ سمجھتا ہے، اور مذہب کے اجنبی اور ناخوش آیند مہمان کو اس کے اصلی وطن (ایشیا) میں دھکیل کر، زور کی اکڑ سے اس دنیا میں دوام کی لاطائل سعی کر رہا ہے وہاں مشرق کا نسیہ پسند ابلہ روحانیت کے اصلی مفہوم کو خیرباد کہہ کر کمزوری اور جمود کی پاکبازی اور ہمہ فروشی سے ہی اپنے آپ کو 'صالح' سمجھتا ہے اور اپنے ہاتھوں آپ مٹ رہنے میں بقا کا راز عبث ٹٹول رہا ہے!

میرا یقین ہے کہ سعی و سکون کے یہ دونوں مناظر افراط و تفریط کے مناظر ہیں، فنا و ہلاک کے مناظر ہیں، حفظ و امن کے مناظر نہیں! اس دنیا کی چار دیواری میں رہ کر کسی قوم کا سچا مذہب اس کے دوام و بقا کا مذہب ہی ہے اور یہی سچی سیاست اور سچی صلاحیت ہے۔ دوام کے لئے جہاں اشد شدید زور کی قطعی ضرورت ہے، وہاں اس زور کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی تزکیہ نفس واحد اور آخری وسیلہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کرایہ پر لیئے ہوئے انسانوں یا زر کے منتظر مزدوروں کی ایک جماعت اس دنیا کے اندر چند لمحوں کے لئے زور پیدا کر دے، اس میں سب لوازمات غلبہ و استیلا کے موجود ہوں، اس میں جو بات ہو لاجواب اور بے مثال نظر آئے، زور آوروں میں اشد زور ہو، کمزوروں میں اشد کمزوری ہو، ایک طرف کمال ہیبت و انبساط ہو، دوسری طرف انتہائے عجز ہو، لیکن ایسے زر خرید زور کو دوام قطعاً نہیں! اس میں 'صلاح' کی باطنی استقامت نہیں، اس میں بلّور کی انکساری صلابت موجود ہے لیکن فولاد کی اندفاعی لچک قطعاً نہیں! ایسی بنا کی مثال ایک مکڑی کے جالے کی ہے جس کو بادِ تند کا ذرا سا جھونکا کالعدم کر دیتا ہے، اور بعد ازاں اس دل آویز تعمیر کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ یورپ کے تمدن کا جزوِ اعظم اسی کمزوری اور نادور بینی پر مبنی ہے۔ اقوام کے اس دنیا میں بقا کے لئے ضروری ہے کہ اس کے افراد کا تخلق حتی الوسع صانعِ فطرت کے اخلاق سے مماثل ہو، اشرف المخلوق انسان سے کسی بہتر مخلوق بننے کا تہیہ ہو، نہ یہ کہ سفلی پیدائش سے ارتقا کیا ہوا 'انسان'، پھر اسی درکِ اسفل کی طرف لوٹ آئے! ایسی تہذیب اپنے پاؤں پر آپ تبر مار رہی ہے گو کہ اپنے زور کے نشے میں وہ فی الحال اس قدر مست ہو کہ اس خودکشی کا کچھ اندازہ نہ کر سکے!

میرا یقین ہے کہ مغرب کو ایک نہ ایک دن اعمالِ خدا کے مشاہدے کو کچھ مدت کے لئے ملتوی کر کے الفاظِ خدا کے مطالعے کی طرف آنا پڑے گا! اس دن ان کی سب حیرت اور تذبذب حالتِ تیقن میں بدل جائے گی، صراطِ مستقیم کے بارے میں ان کے سب شکوک رفع ہو جائیں گے! 'صلاح' کا اکثر غلط تخیل درست ہو کر مکمل ہو جائے گا! ان کے علمِ فطرت سے مستنبط کیے ہوئے اکثر معاشری اور تہذیبی اصول کی تائید ہزاروں برس پیشتر کے کہے ہوئے الفاظ سے حیرت انگیز

[1] پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴-۱۸ء۔ [2] صفات۔ (طلوعِ اسلام)

طور پر ہوگی اُن کو انبیاءؑ کے اس دنیا میں عملی مقام کا صحیح اندازہ ہو جائے گا، اپنی غلط روی کے متعلق صحیح اور نتیجہ خیز معلومات ملیں گی، صحیح روی کی الٰہی اور سرکاری سند مل جائیگی۔

---

(۵) وحدتِ ملّت

میں اسلامی جماعت کے اندر سب نفری اور اعتقادی، سب اقوالی اور اعمالی، سب اتباعی اور غیر اتباعی سب شرعی اور فقہی تفرقے کے بخلاف ہوں، سب کو اعلانیہ مٹانا چاہتا ہوں، سب بطیعوں اور بطاعوں مریدوں اور مرادوں کو خدا کی سرزنش کا قطعی اہل اور عذابِ آخرت کا قطعی مستوجب سمجھتا ہوں لیکن با ایں ہمہ اگر کوئی شخص یا جماعت اس کتاب کے کامل مطالعے کے بعد عقیدتاً یا عملاً مجھ کو اسلام کے کسی نئے فرقے کا بانی تصور کرے تو وہ میری دانست میں نہ صرف مجھے حصبِ جہنم بنا رہی ہے بلکہ آگے چلکر جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں ابدالآباد تک جلتے رہنا اسی کا حصہ ہے!

اسلام میرے نزدیک سب اولیاء و اصفیاء سے گزر کر حضرت محمدؐ (صلعم) کی پیروی ہے، نہیں اُس کے لائے ہوئے قانون کی پیروی ہے انبیاء کے لائے ہوئے طریقِ عمل (دین) کی پیروی ہے، قانونِ خدا کی پیروی ہے۔ آئینِ رب العالمین کی پیروی ہے۔ قانونِ فطرت کی پیروی ہے،

---

(۶) علم و عمل

اہلِ قرآن کو میں سرتاپا علم ثابت کرنا چاہتا ہوں، مگر اسلام میرے نزدیک سرتاپا عمل ہے، اسکی توحید عمل ہے اس کا ایمان عمل ہے اسکا اتقا عمل ہے، اس کی عبادت عمل ہے، اسکا صراط مستقیم عمل ہے، اسکا شرک بدکاری ہے اس کا کفر بدنظمی ہے، اس کا فسق بدعملی ہے، اسکا عمل اُمت کا اجتماعی عمل ہے مستحق اور شفقت عمل ہے ہاتھوں اور پیروں کا عمل ہے دلوں اور جگروں کا عمل ہے، طاقت اور زور کا عمل ہے، دُکھ اور تکلیف کا عمل ہے۔

---

(۷) بقائے دوام کے اصول

جس قوم کے اندر توحید کے یہ سب عظیم الشان اعمال بدرجۂ اتم قائم ہیں، جس کے افراد میں توحید فی العمل، وحدتِ اُمت، اطاعتِ امیر، جہاد بالمال، جہاد بالسیف والنفس، ہجرت، استقامت فی السعی مع التوکل فی النتائج، علم، مکارمِ اخلاق، ایمان بالآخرت کے دس (۱۰) عظیم الشان اصول عملاً اور اعتقاداً موجود ہیں، اُسکا اس دنیا میں ہمیشہ تک بادشاہِ زمین رہنا، جانشینِ زمین میں متمکن رہنا، قائم و دائم رہنا، منظورِ خدا رہنا، منعم علیہ رہنا ایک طے شدہ امر ہے! جب تک زمین و آسمان قائم ہیں اُس اُمت کو کسی طرف سے کوئی آسیب قطعاً نہیں پہنچ سکتا، اس کی زندگی اس دنیا میں قطعاً بے خوف و خطر ہے اور یومِ آخرت کو الجنّۃ کی نعمتِ عظمیٰ کا وارث بن کر ابدالآباد تک آرام پانا اُسی کا حصہ ہے:۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ (زمر)

طلوعِ اسلام نہ ملنے کی شکایت شکایت موصول ہونے پر پندرہ تاریخ تک پرچہ دوبارہ ارسال کیا جا سکے گا۔ اسکے بعد اطلاع آنے پر اگر موجود ہوا تو قیمتاً بھیجا جائیگا۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔

ناظم

بقیہ صفحہ ۱۱ حقائق وعبر سے آگے

ہے کہ "اے خدا مجھ کو میدانِ جنگ میں فتح عطا کر" اس کے برخلاف جو شخص خلوتِ عافیت میں بیٹھا ہوا خدا سے یہ چاہتا ہے کہ میری دعا میں اتنی تاثیر پیدا ہو جائے کہ وہ دشمن کی فوج پر بجلی بن کر گرے یا فرشتے آسمان سے اتریں اور میری قوم کے دشمنوں کو تہ تیغ کر دیں، یہ شخص قدرت کا مضحکہ اڑا رہا ہے جس کے جواب میں قدرت بھی اس کے ارادوں کا مضحکہ اڑانے میں حق بجانب ہے۔ قدرت اس کی دعا کس طرح قبول کر سکتی ہے جبکہ وہ انسانی فرائض بھی غیبی طاقتوں سے پورے کرانا چاہتا ہے۔ قدرت صرف اسی قوم کی حالت بدلتی ہے جو خود اپنی حالت بدلنے کا تہیہ کر لیتی ہے اور جوشِ عمل سے اپنی راہِ ترقی کو رکاوٹوں سے پاک کرنے پر تل جاتی ہے یہ قوم اس گروہ کا مضحکہ اڑانے میں حق بجانب ہے۔ جو صرف توکل ہی کو بنائے اسلام اور حقوق اللہ وحقوق العباد کا ذریعہ تکمیل قرار دیتا ہے۔ اس گروہ کی حالت اس نمک حرام نوکر سے ملتی جلتی ہے جو اپنے غلامانہ کام بھی آقا سے کروانا چاہتا ہے۔"

(ترجمہ:- بہ تشکر "اسلامی تعلیم" لاہور)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/23